Phone: 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست 1961ء

ارشاد خداوندی

ما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا (۱۱/۶)۔
صفحہ ارض پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں
جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔

تشریح نبوی ؐ

ایما اھل عرصۃ اصبح فیھم امرؤ جائعا فقد برئت منھم ذمۃ اللہ
(مسند امام احمد)
جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات
بھر بھوکا رہا اُس بستی سے اللہ کی حفاظت و نگرانی کا ذمہ ختم ہوا۔

یعنی خدا کی، رزق پہنچانے کی ذمہ داری، معاشرہ پر عائد ہوتی ہے اور جو معاشرہ اس فریضہ کو سرانجام نہیں دیتا وہ خدا کی حفاظت میں نہیں رہتا۔

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت ۷۵ پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدل اشتراک
ہند و پاکستان سے سالانہ :- آٹھ روپے
غیر ممالک سے سالانہ :- ۱۶ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہند و پاکستان سے
۷۵ نئے پیسے

ٹیلیفون نمبر ۵۰۰۰۷
خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی گلبرگ - لاہور

جلد ۱۴ | اگست ۱۹۶۱ء | نمبر ۸

فہرستِ مضامین

لمعات ______ ۲
باب المراسلات (متفرق سوالات، حرمت شراب - عائلی قوانین) ______ ۱۲
عیسائیت کیوں پھیل رہی ہے؟ (جارج ویسٹ واٹر) ______ ۲۵
مغربی افریقہ عہدِ اسلامی میں (محترم ثروت خاں صاحب) ______ ۳۳
القرآن العظیم (محترم پرویز صاحب) ______ ۴۹
تعارف مفہوم القرآن (محترم پرویز صاحب) ______ ۶۲
رابطۂ باہمی ______ ۷۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ربیع الاوّل کا مبارک و مسعود مہینہ، اپنی جاں نواز شادابیوں اور بصیرت افروز تابانیوں کے ساتھ پھر وجہ تازگیٔ عالم ہو رہا ہے اور اُس انقلاب عظیم کی یاد تازہ کرا رہا ہے جو دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتا ہے، انسانی تمدّن کے متعلق عام تحقیق یہی ہے کہ اس کی عمر پانچ چھ ہزار سال سے زیادہ نہیں، اس نقطۂ نظر سے غور کیجئے تو یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گی کہ انسانی علم و تہذیب نے جو ترقی، نبی اکرمؐ کے ظہورِ قدسی کے بعد، ڈیڑھ ہزار سال کے عرصہ میں کی ہے، اس سے قبل، چار پانچ ہزار سال کے عرصہ میں، اس کا عشر عشیر بھی اس کے حصّے میں نہیں آیا تھا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:

> حضورؐ کی بدولت زندگی نے علم کے ان سرچشموں کا سراغ پا لیا جن کی اسے اپنی نئی شاہراہ کے لئے ضرورت تھی۔ اسلام کا ظہور، استقرائی علم کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی اور اس تکمیل سے اس نے خود اپنی خاتمیت کی ضرورت کو بے نقاب دیکھ لیا۔ اس میں یہ لطیف نکتہ پنہاں ہے کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے شعورِ ذات کی تکمیل ہو گی تو یونہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے مذہبی پیشوائیت اور وراثتی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا، قرآن کریم، غور و فکر اور تجارب و مشاہدات پر بار بار زور دیتا ہے اور تاریخ اور فطرت دونوں کو علم انسانی کے ذرائع ٹھہراتا ہے۔ (خطبات تشکیل جدید۔ صفحہ ۱۲۰)

دنیا نے، علم و بصیرت اور تہذیب و تمدن میں، اس ڈیڑھ ہزار سال کے عرصہ میں جس قدر محیر العقول اور برق رفتار ترقی کی ہے، اس کا بنیادی سبب، انسانی فکر کی وہ تبدیلی ہے جو بعثتِ محمدیہؐ نے پیدا کی اور جس سے زندگی کے

خواب نے تعبیرِ نو اختیار کی۔ یہ دعوے کہ دنیا کی اس حیاتِ نو کا بنیادی سبب، ظہورِ قدسی ہے، ہماری عقیدت مندی پر مبنی نہیں، بلکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف غیر مسلم محققین تک نے کیا ہے۔ ان کا اعلان یہ ہے کہ

> یورپ کی نشاۃِ ثانیہ پندرھویں صدی میں نہیں ہوئی بلکہ اس وقت ہوئی جب یورپ عربوں کے کلچر سے متاثر ہوا۔۔۔ اگر عرب نہ ہوتے تو یورپ کی تہذیب کا وجود عمل میں نہ آتا۔ ان کے بغیر یہ یقیناً اس خصوصیت کو حاصل نہ کر سکتا تھا جس نے اسے ارتقائی مراحل میں بلند ترین سطح پر لا کھڑا کیا۔۔۔۔ عصرِ حاضر کی حقیقی قوت کا راز سائنس میں ہے اور ہماری سائنس کا وجود عربوں کا شرمندۂ احسان ہے۔ اسلام سے پہلے کی دنیا درحقیقت "زمانۂ قبل از سائنس" تھی۔ (بریفالٹ۔ تشکیلِ انسانیت)

اس ذاتِ اقدس و اعظم (علیہ التحیۃ والسلام) کی عدیم النظیر تعلیم نے، دنیائے علم و بصیرت ہی میں انقلاب پیدا نہیں کیا، بلکہ ایک ایسے آئینِ جہانبانی و جہاں رانی کی بھی بنیاد رکھی جو انسان کو حقیقی آزادی عطا کر کے اس کی پستیوں کو سرفرازیوں میں بدل دے، اور یوں دنیا اور آخرت دونوں میں، اسے خوشگواریوں اور سربلندیوں کی جنت سے ہم آغوش کر دے۔

> نبی اکرمؐ ایک مذہب ہی کے بانی نہ تھے بلکہ ایک سلطنت کے بھی تھے — لیکن ایک ایسی سلطنت کے جو شروع ہی سے دینی سلطنت تھی۔ یعنی جس میں دنیا اور آخرت دونوں کا امتزاج تھا۔ اسلام کے پیشِ نظر یہ تھا کہ تمام انسانوں کے امتیازات مٹا کر انہیں ایک جماعت بنا دیا جائے۔ جس کا مسلک قانونِ خداوندی اور اس کے رسول کی اطاعت ہو اور اس طرح حق کو ساری دنیا پر پھیلا دیا جائے۔ محمدؐ دنیا میں "خدا کی مرضی" کی تنفیذ و اشاعت کے لئے مرکزی ہیئتِ اجرائیہ کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنے پیشرو انبیاء کی طرح محسوس کر لیا تھا کہ تمام نوعِ انسان ایک دن امتِ واحدہ بن کر رہے گی۔۔۔ یعنی ایک خدا کے ماتحت ایک حکومت — اس نے انسان کے تمام فرائضِ حیات کو ایک لفظ میں سمیٹ کر رکھ دیا۔ اور وہ لفظ ہے اسلام۔ یعنی اپنے جذبات اور ارادوں کو مشیتِ ایزدی کے تابع رکھنا۔ یہ تسلیم و رضا اس اطاعت و انقیاد سے مختلف ہے جو مادی ریاست میں حکومت کی طرف سے مطلوب ہوتی ہے۔ کسی دنیوی حکمران کے سامنے جھکنے اور خدا کے سامنے جھکنے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ جو خدا کے سامنے جھک کر مسلم بن جاتا ہے۔ اس کے ذمے اس دنیا

اور اگلی دُنیا دونوں کے فرائض عائد ہو جاتے ہیں۔ یعنی اخلاقی بھی اور روحانی بھی ــــ خدا کی مرضی معلوم کرنا اور اس کی تعمیل کرانا ــــ اس طرح مسلم، بیک وقت ایک راہب اور ایک سپاہی بن جاتا ہے۔ نمازی بھی بنتا ہے اور میدانِ جنگ میں جانے کے لئے بھی ہر وقت تیار رہتا ہے ــــ لیکن صرف اس جنگ کے لئے جو دنیا میں شر کو مٹانے کے لئے کی جائے۔

(SPALDING – CIVILISATION IN EAST & WEST.)

لیکن دنیائے علم اور جہانِ تمدن و سیاست سے کہیں زیادہ گہرا انقلاب وہ تھا جو حضور رسالتمآبؐ (فداہ ابی و امی) نے دلوں کی دنیا میں پیدا کر دیا، اور اس کا حقیقی ذریعہ حضورؐ کا بلند ترین کردار اور مقدس ترین سیرت تھی ــــ وہ عظیم المرتبت کردار جس کی رفعت و بلندی کو دیکھ کر، دنیا کے بڑے بڑے مورخین ہمہ تن استفسار ہیں کہ بالآخر اس کا راز کیا تھا؟ وہ اس فرطِ حیرت و فورِ تعجب میں بیساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ

آج جبکہ خود ہمارے عہد کے انسانوں نے ان تمام تفاصیل کو بے نقاب کر دیا ہے جو اس انقلاب آفریں شخصیت کی زندگی سے متعلق ہیں ــــ اس کی ابتدائی اور آخری ہر دو ادوارِ حیات سے متعلق ــــ اس حقیقت کا کماحقہٗ سمجھنا پھر بھی آسان نہیں ہوا کہ اس عظیم القدر ہستی کا کردار کس قدر بلند، اور اس کی کامیابی کا راز کیا تھا؟ اس نے کبھی یہ دعوٰے نہیں کیا کہ اسے خدائی قوتیں حاصل ہیں۔ اس نے اپنے آپ کو ایک عام انسان اور خدا کے پیغمبر سے زیادہ حیثیت کبھی نہیں دی۔ بایں ہمہ اس نے اپنی قوم کے ممتاز ترین افراد کو اپنا حلقہ بگوش بنا لیا اور ان پر اپنے کردار کا ایسا گہرا اثر ڈالا کہ نہ اُس زمانے میں جبکہ اسے چاروں طرف سے مصائب و آلام نے گھیر رکھا تھا اور نہ اُس وقت جب وہ ایک عظیم الشان سلطنت کا مالک بنا، اُسے اپنی جماعت کے کسی ایک فرد کے خلاف غداری کی شکایت ہوئی۔ اسے اپنی ذات پر اعتماد اور نصرتِ خداوندی پر یقینِ محکم، شکست اور مایوسی کی حالت میں اس سے بھی کہیں زیادہ ہوتا تھا جب وہ فتح و ظفر کے عالم میں دشمنوں سے اپنی شرائط منواتا تھا۔ (اس نے اسی طرح ساری زندگی بسر کی اور اس کے بعد) اپنے متبعین، عقیدتمندان اور احباب کے حلقہ میں (نہایت سکون سے) آنکھیں بند کر لیں۔ نہ اس کی زندگی کا کوئی گوشہ زیرِ نقاب رہا۔ نہ اس کی موت کسی رازداری کی موت ہوئی۔ (Hyndman — The Making of Asia)

حضورؐ کی یہی وہ مقدس ترین سیرت اور بلند تریں کردار ہے جسے رب کائنات نے شرف و مجدِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ قرار دیا (وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ۔ ۵۳/۷) اور نوعِ انسان کے لئے حسین ترین نمونہ ٹھہرایا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۶۰/۴)

کا ارشاد خداوندی اس پر شاہد ہے۔

قرآن کریم نے دو گرامی قدر و والا تبار ہستیوں کی سیرت و کردار کو انسانوں کے لئے "اسوۂ حسنہ" قرار دیا ہے ـــــ ایک حضرت ابراہیمؑ اور اُن کے رفقاء، جن کے متعلق سورۂ ممتحنہ میں بعینہٖ یہی الفاظ آئے ہیں (دیکھئے ۶۰/۴) اور دوسرے نبی اکرمؐ ـــــ چونکہ ان برگزیدہ ہستیوں کی سیرت و کردار کو ہمیشہ کے لئے مشعلِ ہدایت بننا تھا، اس لئے قرآن کریم نے ان کے اہم نقوش کو اپنی دفتین میں محفوظ کر لیا تاکہ نوعِ انسان کو، انہیں اپنے سامنے بطور نمونہ رکھنے میں، کسی قسم کا شک و شبہ، یا ابہام اور الجھاؤ نہ رہے اور وہ دل کے پورے سکون اور اطمینان کے ساتھ کہہ سکیں کہ ہم، حتمی اور یقینی طور پر اُن نقوش پا کا اتباع کر رہے ہیں جو کاروانِ انسانیت کو ان کی صحیح منزلِ مقصود تک لے جانے کے لئے، واحد اور حقیقی چراغِ راہ ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی سیرتِ طیبہ میں انسانی ہاتھوں نے بہت سی تحریف کر دی تھی اور وہ اپنی اصلی شکل میں (تورات و انجیل تک میں) کہیں باقی نہیں رہی تھی۔ جب خدا نے آپؑ کی سیرت کو نوعِ انسان کے لئے اسوہ قرار دیا، تو اسے، انسانی مزخرفات کی آمیزش سے منزہ اور پاکیزہ کر کے، لوحِ قرآنی میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ اسی طرح جب حضور نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کو عالمگیر انسانیت کے لئے بہترین نمونہ قرار دیا تو اس کے ابدِ درکنار گوشوں کو بھی اُسی صحیفۂ ربانی کے اوراق میں سمیٹ لیا تاکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انسانی دستبرد سے محفوظ ہو جائیں ـــــ اور ایسا کرنا نہایت ضروری تھا۔ یہ کس قدر زیادتی ہوتی کہ حضورؐ کی سیرت کو نوعِ انسانی کے لئے نمونہ قرار دیا جاتا۔ لیکن اس سیرت کے متعلقہ خط و خال کو محفوظ طریق سے انسانوں تک نہ پہنچایا جاتا۔ خدائے کائنات کے حسنِ انتظام سے یہ بعید تھا۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ تاریخ (یا تورات) میں سیرتِ ابراہیمیؑ کے متعلق لکھا ہے، اس کی صحت و سقم کے پرکھنے کے لئے قرآن کریم ہی واحد معیار ہو سکتا ہے۔ ان کے بیانات میں سے جو کچھ قرآن کریم کے مطابق ہو، اسے صحیح کہیں گے، جو اس کے خلاف ہو اُسے غلط کہا جائے گا۔ یہی پوزیشن نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کے ان کوائف و سوانح کی ہے جو ہماری کتبِ تاریخ و روایات میں مندرج ہیں۔ ان کی صحت و سقم کے پرکھنے کا معیار بھی قرآن کریم ہی ہے۔ ان میں جو کچھ قرآن کے مطابق ہو، اسے صحیح تسلیم کیا جائے گا، جو اس کے خلاف ہو، اُسے غلط قرار دیا جائیگا۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر، مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم، جو حکمت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے شارحِ خصوصی

اور مولانا محمود الحسنؒ کے تلمیذ خاص تھے، کتب روایات کو کتب انجیل کے ہم درجہ قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ان لوگوں کی اصطلاح پر (یعنی حدیث کو وحی ماننے والوں کی اصطلاح پر) اگر کتب مقدسہ سابقہ کو کتب حدیث کا درجہ دیا جائے تو بطریق ادلٰے اس کو مستبعد نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اگر یہ لوگ اس بات کو تسلیم کرلیں تو تمام اشکال حل ہو جائیں۔ (۱) ہماری کتب حدیث میں بالاتفاق غیر صحیح روایات بھی موجود ہیں۔ (۲) نیز ان کتب حدیث میں ایک واقعہ کو مختلف طریقوں سے بھی روایت کیا گیا ہے۔ (۳) ہماری بہت سی کتب حدیث میں کاتبوں سے غلطیاں ہوتی رہتی ہیں جن کو محققین علماء درست کرتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد اگر اناجیل اربعہ کو ہماری صحاح اربعہ (صحیحین، ابوداؤد۔ ترمذی) کے درجہ پر رکھ دیا جائے، تو ذرہ برابر اختلاف نظر نہیں آئے گا۔ (الفرقان۔ شاہ ولی اللہ نمبر صفحہ ۶۷-۲۶۶)۔

اس حقیقت کو تسلیم نہ کرنے کا نتیجہ ہے کہ حضور نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ کے خلاف، دشمنان اسلام کو اعتراضات کا موقع مل جاتا ہے۔ ان اعتراضات کی بنیاد، ہماری کتب روایات پر ہوتی ہے جس دن ہم نے اس حقیقت کو تسلیم کرلیا، اور حضورؐ کی سیرت مقدسہ کا معیار قرآن کریم کو قرار دے دیا، اعتراضات کے سارے بادل چھٹ جائیں گے۔ شکوک و شبہات کے دھندلکے دور ہو جائیں گے۔ اور دنیا کی اس عظیم ترین منفرد ذات گرامی کی بلند و بالا، پاکیزہ و مقدس سیرت، اپنی اصلی و حقیقی شکل میں آفتاب جہاں تاب کی طرح نکھر کر دنیا کے سامنے آجائے گی اور صحن عالم کو بقعۂ نور بنا دے گی۔

یہ طلوع اسلام کی پہلے دن سے پکار ہے۔ اور اس کا محرک، حضور رحمۃ للعالمین کی ذات اقدس کا وہ احترام ہے جو ہر مسلمان کا جزو ایمان ہے اور جس کے بغیر کسی انسان پر نجات و سعادت کی راہ نہیں کھل سکتی۔ ہم ارباب علم و بصیرت سے گزارش کریں گے کہ وہ غور کریں اور بتائیں کہ کیا طلوع اسلام کی اس دعوت میں کوئی بات قابل اعتراض ہے یا (معاذ اللہ) حضورؐ کی ذات گرامی کی شان اقدس کے منافی ہے یا اس سے حضورؐ کی صحیح عظمت سامنے آتی ہے؟

نبی اکرمؐ کا فریضۂ رسالت یہ بھی تھا کہ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق معاشرہ متشکل کیا جائے۔ اس کے اصولوں کی بنیادوں پر نظام مملکت قائم کیا جائے۔ حضورؐ نے اس فریضہ کو بھی بطریق احسن و خوبی سرانجام دیا اور ایک ایسی مملکت کی بنیاد ڈالی جو قرآنی مقصد و منشائے خداوندی کو پورا کرتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس مملکت کی

تشکیل قرآنی تصورات زندگی اور اصولِ حیات کے عین مطابق ہوئی تھی، لیکن ان تصورات کو، لامحالہ، اُس زمانے کے تقاضوں اور اس دَور کے حالات کے مطابق ہی عملی جامہ پہنایا گیا تھا۔ ہمارے ہاں ایک گروہ کا کہنا یہ ہے کہ حضورؐ نے جس جس طریق سے اس مملکت کو متشکل فرمایا، اور قانون کی جو جو جزئیات نافذ فرمائیں، حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے اتباع کا تقاضا ہے کہ ان طریقوں اور قانونی تفاصیل و جزئیات کو، ہر زمانے میں، من وعن اختیار کیا جائے۔ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ دوسرے گروہ کا کہنا یہ ہے کہ قرآن کریم کے اصول و احکام، جن کے مطابق اسلامی مملکت متشکل ہوتی ہے، غیر متبدل ہیں ——— ان میں کسی زمانے میں بھی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان اصولوں کو عمل میں لانے کے لئے جو جزئی قوانین اختیار کئے جائیں، وہ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے جائیں گے۔ مثلاً قرآن کریم نے زکوٰۃ کا حکم دیا ہے لیکن اس کی جزئیات خود متعین نہیں کیں۔ نبی اکرمؐ نے (روایات کے بیان کے مطابق) اس سلسلہ میں کچھ قوانین و ضوابط نافذ فرمائے جن کی رُو سے زکوٰۃ کا نصاب (یعنی زکوٰۃ کس سے وصول کی جائے گی) اور اس کی شرح (یعنی کس حساب سے وصول کی جائے گی) اور دیگر متعلقہ قوانین نافذ فرمائے ——— نصاب (مثلاً) یہ کہ جس کے پاس ۵۲½ تولہ چاندی یا ۷½ تولہ سونا ہو اور اس پر ایک سال گذر جائے اس سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ اور شرح اس کی ۲½ فی صد ہوگی۔[۱] اوّل الذکر گروہ کا کہنا ہے کہ کوئی اسلامی حکومت کسی زمانے میں بھی اس نصاب اور اس شرح میں کمی بیشی نہیں کر سکتی۔ جب ان سے کہا جائے کہ اگر اس آمدنی میں حکومت کا کام نہ چلے تو وہ کیا کرے۔ تو وہ کہتے ہیں کہ یہ خداوندی ٹیکس ہے اسے اسی طرح رہنے دیا جائے گا۔ حکومت اپنا ٹیکس الگ لگا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حل، دین و دُنیا اور مذہب و سیاست کی ثنویت کے اس تصور کا پیدا کردہ ہے جس کی رُو سے عیسائیت، خدا اور قیصر کی مملکتوں کو الگ الگ فرض کرتی تھی۔ اسلام اس ثنویت کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔ اس کی رُو سے، صحیح اسلامی مملکت جو کچھ وصول کرے، وہ خدائی ٹیکس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ، خدا کا جداگانہ ٹیکس کوئی نہیں ہوتا۔ دوسرے گروہ کا کہنا یہ ہے کہ (اگر روایات کا بیان صحیح ہے تو اس سے یہ سمجھا جائے گا کہ) نبی اکرمؐ کے زمانہ میں، حکومت نے زکوٰۃ کی اتنی آمدنی کو کافی سمجھا ہوگا۔

---

[۱] علاوہ دیگر امور، یہ امر قابلِ غور ہے کہ موجودہ نرخ کے مطابق ۵۲½ تولہ چاندی کی قیمت تقریباً ۱۰۵ روپے ہوتی ہے اور ۷½ تولہ سونے کی قیمت تقریباً ۹۰۰ روپے۔ مذکورہ بالا نصاب کا مطلب یہ ہوگا کہ جس شخص کے پاس ۱۰۵ روپے کی مالیت کی چاندی کا زیور ہو اس پر تو زکوٰۃ واجب ہو جائے گی لیکن جس کے پاس آٹھ ساڑھے آٹھ سو روپے تک کی مالیت کا سونے کا زیور ہو، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ نظر آتا ہے کہ یہ حضورؐ کا تجویز فرمودہ نصاب نہیں ہو سکتا۔

اگر آج کی اسلامی حکومت اس سے زیادہ کی ضرورت سمجھے، تو وہ اس کے لئے اپنے قوانین مرتب کر سکتی ہے۔ اس دوسرے گروہ میں، امام ابوحنیفہؒ۔ شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی۔ اور علامہ اقبال جیسی نامور ہستیاں شامل ہیں۔ اس ضمن میں ہم، علامہ اقبال کے خطبات سے وہ اقتباس درج ذیل کرتے ہیں جس میں انہوں نے اس اہم اصولی مسئلہ سے بحث کی ہے۔ اگرچہ ہم اس اقتباس کو، اس سے پہلے متعدد بار پیش کر چکے ہیں، لیکن موضوع زیر نظر کی اہمیت کے اعتبار سے، اس کا (بار دیگر) درج کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

احادیث کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اوّل الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہٖ رکھا اور بعض میں ترمیم و تنسیخ کر دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانۂ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا ہے۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہٖ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے۔ لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلک زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوع انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن اصولوں کا نفاذ اس قسم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں

اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ انہیں آنے والی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوین فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث سے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوین فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ اُن کے زمانے میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اوّل تو یہ کہنا ہی دُرست نہیں کہ اُن کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہریؒ کے مجموعے اُن کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحب تک نہیں پہنچ پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں تو اگر امام صاحبؒ اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں، میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا۔ اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہو گا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔

خطبات اقبال (صفحہ ۱۶۳-۱۶۴)

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

واضح رہے کہ جب اساسی قانون پر عملدرآمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ قانون اساسی غیر متبدل ہوتا ہے اور تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں۔ ہم سنت ان تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں جو رسول اللہ صلعم اور آپ کے بعد خلفائے ثلاثہ نے مسلمانوں کی مرکزی جماعت کے مشورے سے تجویز کئے۔ خلافت عثمانیہ کے بعد یہ نظام ٹوٹ گیا کہ تمام کام مشورے سے کئے جائیں..... سنت کو ہمارے

فقہائے حنفیہ رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین میں مشترک مانتے ہیں اور یہی ہماری رائے ہے اور یہ سُنّت قرآن ہی سے پیدا ہوگی۔ آج کل کی اصطلاح میں اس کو بائیلاز کہا جاتا ہے..... اصل قانون اساسی متعین ہے۔ بائیلاز اُس وقت اور تھے اِس وقت اور ہوں گے جن میں زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق فردی تبدیلیاں ہوں گی۔ نئی نئی پیش آمدہ صورتوں کے متعلق تفصیلی احکام کا استخراج ہوگا: اور اس کا نام فقہ ہے۔" (صفحہ ۲۶۴)

طلوع اسلام ان حضرات (علیہم الرحمۃ) کے مسلک سے متفق ہے۔ اور یہی وہ "جُرم" ہے جس کی بنا پر اسے منکرِ حدیث منکرِ شانِ رسالت، منکرِ سُنّت، فلہذا، فتنہ پرداز، ملحد، بے دین، ایک نئے اسلام کا بانی، اور نہ معلوم کیا کیا کہا جاتا ہے۔؟

کیا آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ یہ حضرات، امام اعظم، شاہ ولی اللہ، علامہ اقبال یا مولانا سندھی کے متعلق ایک لفظ نہیں کہتے اور طلوع اسلام کے خلاف اس شد و مد سے پراپیگنڈا کرتے ہیں، حالانکہ طلوع اسلام انہی کے مسلک کی تائید کرتا ہے۔ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا۔ اور تائید بھی اس لئے کرتا ہے کہ اس کے نزدیک یہ مسلک قرآن کریم کی منشاء کے مطابق ہے۔

اس ضمن میں اس حقیقت کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ اگرچہ صحیح نظام کے لئے صحیح قوانین کا ہونا ضروری ہے، لیکن اس نظام کی عمارت، سیرت و کردار کی پختگی اور پاکیزگی پر استوار ہوتی اور قائم رہتی ہے۔ عہد نبوی کی اسلامی مملکت نے جو انسانیت ساز نتائج مرتب کئے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ قانون کو بلندیٔ سیرت کی قوت سے نافذ کیا جاتا تھا۔ جب معاشرہ قرآنی اصولوں کے مطابق متشکل ہو تو اس سے افراد میں پاکیزگیٔ سیرت اور بلندیٔ کردار پیدا ہوتی ہے، اور اس کے زور پر وہ معاشرہ آگے بڑھتا ہے۔ جب تک یہ صورت قائم رہتی ہے۔ قانونی جزئیات کی تبدیلی سے اصل نظام میں کوئی فرق واقعہ نہیں ہوتا ــــ بلکہ، اس تبدیلی سے اس کے حسنِ نظم و تدبیر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ تبدیلی زمانے کے تقاضوں کو بطریقِ احسن پورا کرتی ہے ــــ لیکن اگر سیرت کی پاکیزگی نہ رہے، تو محض قانونی جزئیات کی، پابندی، وہ نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔ اس کا بلکہ الٹا اثر ہوتا ہے۔ قانونی جزئیات (ظواہر) کی پابندی کو مقصود بالذات سمجھ لیا جاتا ہے، اور سیرت و کردار کی اہمیت نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ ہماری گذشتہ کئی صدیوں کی تاریخ اس کی زندہ شہادت ہے۔ ہماری وعظیں۔ نصیحتیں ــ تلقینیں۔ تاکیدیں۔ بحثیں، سب قانونی جزئیات کی پابندی کے گرد گھومتی رہیں سیرت کو اول تو درخور اعتنا ہی نہ سمجھا گیا اور اگر اس کا کبھی نام بھی لیا گیا تو محض تبرکاً۔ (الا ماشاء اللہ) نتیجہ اس کا یہ کہ جو طبقہ ان جزئیات

کی پوری پوری پابندی بھی کرتا ہے، سیرت و کردار کی بلندی کی اہمیت — جو دین کی اصل و غایت تھی — بالعموم اس کی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے، اور وہ ان ظواہر ہی کو اتباعِ سُنّت اور اصل دین سمجھنے لگ جاتا ہے۔ یاد رکھئے اتباعِ سُنّت اس میں نہیں کہ زکوٰۃ کی شرح ۲½ فی صد سے بدلنے نہ پائے۔ اتباعِ سنت یہ ہے کہ حکومت کی آمدنی کو جس للّٰہیت کے ساتھ حضورؐ صرف فرماتے تھے، اس میں فرق نہ آنے پائے۔ اسی کو اللہ نے، حضور کا وہ اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے جس کا اتباع قیامت تک کے لئے ہر مومن کا فریضۂ زندگی اور جزوِ ایمان ہے۔ اگر کوئی صحیح قرآنی مملکت — جسے خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے — عہدِ اوّل کے مرتب کردہ کسی قانونی جزئیہ میں بہ تقاضائے وقت، تبدیلی کی ضرورت محسوس کرے، تو یہ چیز اتباعِ اسوۂ حسنہ کے خلاف نہیں ہوگی۔ وہ اسوۂ مقدسہ کی خلاف ورزی اس وقت کرے گی جب سیرت و کردار میں حضورؐ کے نقوشِ قدم کی پیروی نہیں کرے گی۔

ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جن امور کو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رکھنا تھا انہیں قرآن کریم کے اندر محفوظ کر دیا — یہ اصول و قوانین، و احکام ہوں یا حضورؐ کا اسوۂ حسنہ — اور جو امور ایسے تھے جن میں، زمانے کے حالات کے مطابق تبدیلی کی جا سکتی تھی، انہیں نہ خدا نے اپنی کتاب میں محفوظ کیا، نہ رسول اللہؐ نے منضبط کر کے اُمّت کو دیا۔ نہ ہی خلافتِ راشدہ نے انہیں ضبطِ تحریر میں لا کر ان کی حفاظت کا انتظام کیا۔ سابقہ اُمّتوں میں خرابی اس لئے پیدا ہوئی تھی کہ ان کے ہاں دینِ خداوندی محفوظ شکل میں باقی نہ رہا اور، انہوں نے غیر محفوظ شریعت کو غیر متبدل قرار دے کر اسے دین کا درجہ دے دیا۔ ہم نے بھی یہی کیا۔ جن امور کو خدا نے اپنی کتاب میں محفوظ نہیں رکھا تھا — اس لئے کہ انہیں غیر متبدل دین بنانا مقصودِ خداوندی نہ تھا — ہم نے انہیں غیر متبدل دین کا درجہ دے دیا۔ اس کا نتیجہ وہی اختلاف و انتشار تھا جو پہلی امتوں میں رونما ہوا تھا۔ اُمّت میں دینِ خداوندی کو رائج کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ اور وہ یہ کہ

(۱) معاشرہ اس اصول کو اپنی بنیاد تسلیم کرے کہ اس کا تمام کاروبار قرآن کریم کے اصول و قوانین کے مطابق ہوگا جن میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکے گی۔ اسی کو خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جائے گا۔ اس کے فیصلوں کی اطاعت اُمّت پر واجب ہوگی۔ (۲) اس معاشرہ کے افراد سیرتِ محمدیہ کو بطور اسوۂ حسنہ اپنے سامنے رکھیں گے۔ (۳) سیرتِ محمدیہ کے جو گوشے قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں، ان کی صداقت میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کے باہر جو کچھ ہے، اسے صحیح اور غلط ہونے کا معیار، قرآن کریم ہے۔ جو اس کے مطابق ہے صحیح ہے، جو اس کے خلاف ہے، وہ غلط ہے۔

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (۱۲/۴۰)

بابُ المُراسلات

(متفرق استفسارات)

گجرات سے ایک صاحب کا حسب ذیل خط موصول ہوا ہے۔

چند موٹے موٹے اختلافی مسائل کے متعلق جناب کی رائے سے مستفید ہونے کی آجکل کے زمانہ کے حالات میں ازحد ضرورت ہے۔ اس لئے استدعا ہے کہ ان کے سلسلہ میں قرآن مجید کی روشنی میں ان کے جوابات اپنے مؤقر رسالہ میں دے کر مشکور فرمادیں۔ تاکہ جملہ مسلمانانِ پاکستان ان سے فیضیاب ہوسکیں۔ چونکہ جناب کا قرآن مجید پر کامل عبور ہے۔ اس لئے یہ تکلیف دی ہے۔

سوال (۱) سود کا لینا، دینا از روئے قرآن مجید حرام مطلق ہے۔ اس کی کوئی تاویل قرآن مجید میں نہیں ہے۔ کہ فلاں قسم کا سود حرام اور فلاں قسم کا جائز ہے۔ موجودہ زمانہ میں کاروبار تجارت کا دارومدار سود پر ہے۔ .... اس بارہ میں آپ کی رائے کیا ہے۔

(۲) زکوٰۃ کے علاوہ دیگر ٹیکس جو حکومت لوگوں سے لیتی ہے۔ ان کے جواز یا عدم جواز کے بارہ میں جناب کی کیا رائے ہے۔ کیا دیگر مروجہ ٹیکسوں کی موجودگی میں زکوٰۃ کو نظرانداز کر دینا چاہیئے یا زکوٰۃ کو بحال رکھ کر ان کو نظرانداز کرنا مناسب ہوگا۔

(۳) وقف علی الاولاد کا مروجہ قانون قرآن مجید کی کس آیت یا حکم کے ماتحت ہے۔ اگر یہ قانون غیراز قرآن ہے، تو یہ کیوں منسوخ نہ ہونا چاہیئے۔ جس کی رُو سے جائیدادیں قیامت تک ایک خاص گروہ کی تحویل میں رہ جاتی ہیں۔ جن کو ان کی فروخت کی بھی اجازت نہیں اور آمدنی بکثرت حصہ داروں میں بٹ کر آہستہ آہستہ بالکل معدوم ہو جاتی ہے

(۴) حق شفع کا قانون قرآن مجید کے کس حکم کے ماتحت جاری ہے۔ جس کی وجہ سے مالک جائیداد اپنی جائیداد کی پوری قیمت وصول نہیں کر سکتا۔ بلکہ شفیع کی مرضی کے تابع ہو جاتا ہے۔ یا سودا کرتے وقت ناجائز طور پر بخوف حق شفع اس کی قیمت حد سے زیادہ فرضی طور پر لکھواتا ہے۔ کیا اس قانون کی وجہ سے مالک جائیداد کے آزادانہ حق فروخت میں دست اندازی از روئے قرآن مجید جائز ہے اور اس کا مفاد کیا ہے۔

(۵) قانون وراثت میں ایک مالک کو اپنی پوری جائیداد کے متعلق انصاف سے اپنے لواحقین جس میں ماں باپ بھی شریک ہیں پورے مال کے متعلق وصیت کرنے کا کیوں حق حاصل نہیں۔ بلکہ کسی ایسے شخص کو جس نے اس کی خدمت کی ہو۔ وصیت میں کیوں شامل نہیں کر سکتا۔ بجائے ان رشتہ داروں یا تعلق داروں کے جنہوں نے عمر بھر اس کو چین لینے دیا ہو۔ مگر اس کی موت کے بعد اس کی جائیداد کے وارث بن جاتے ہوں۔ وصیت کا حق از روئے قرآن مجید سب سے اول مالک کو حاصل ہے اور ہونا بھی چاہیئے۔ اور جب اس کی وصیت پوری ہو چکے اور جو کچھ باقی بچ رہے۔ اس کی تقسیم وارثان میں مطابق تجویز و حکم قرآن ہونی مناسب ہے جناب کی اس بارہ میں کیا رائے ہے۔

(۶) حلالہ کا جو قانون قرآن مجید ہے۔ اس سے پایا جاتا ہے۔ کہ ایک خاوند اگر اپنی بیوی کو بدچلنی کے شک پر طلاق دیدے۔ تو وہ اگر کسی آشنا سے جس کی وجہ سے اس کے پہلے خاوند نے اسے طلاق دی ہے۔ نکاح کر سکتی ہے۔ اور اس شک کو یقین کا درجہ دے کر مطلقہ ہو جانے پر پھر پہلے خاوند سے نکاح کر سکتی ہے۔ کیا ایسا ہونا اخلاقاً درست اور روا ہے۔ رائے عالی سے مستفید فرماویں۔ کوئی تاویل خلاف قرآن نہ پیش کی جاوے۔

(۷) لڑکیوں کو لڑکوں سے وراثت میں نصف حصہ کس بنا پر تجویز کیا گیا ہے۔ درانحالیکہ لڑکیاں اور لڑکے پیدائش اور پرورش کے لحاظ سے ماں باپ کی نظر اور سلوک میں یکساں درجہ رکھتے ہیں۔

(۸) جب لڑکیاں بھی اپنے والدین کی جائیداد میں حق دار قرار دی جاویں۔ تو ان کے نکاح اور شادی کے وقت ان کو جہیز کس بنا پر دینا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ نیز جہیز کی کوئی حد کیوں مقرر نہیں کی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرہ میں بہت خرابی پیدا ہو رہی ہے۔ بلکہ جہیز میں کمی اکثر حالات میں مانع نکاح ثابت ہوئی ہے۔ اس بارہ میں جناب کی کیا رائے ہے۔

(۹) نیک مسلمان کو اپنی جائز منکوحہ بیوی کے علاوہ ایک لونڈی بطور زوجہ بلا نکاح رکھنے کی اجازت ہے۔ اس کا کیا مفاد ہے۔ واضح فرما کر مشکور فرماویں۔

(۱۰) ازروئے قرآن مجید جب مسلمان مرد باوجود لاکھ کوششوں کے دو بیویوں کے درمیان انصاف اور عدل نہیں کر سکتے تو پھر ان کو ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی کیوں ایک ناممکن امر کی موجودگی میں اجازت دی گئی ہے۔ اور اس فعل میں کیا فائدہ مضمر ہے۔ واضح فرما کر مشکور کریں۔

(۱۱) جب نبی اکرمؐ نے گیارہ بیویاں اپنے نکاح میں رکھیں تو عام مسلمانوں کو فقط چار کی اجازت دی گئی۔ مُلّا کہتا ہے۔ کہ چار کی تعداد مقرر ہونے سے پہلے پیغمبرؐ نے ایسا کیا تھا۔ اور بعد میں چار کی حد مقرر ہوئی۔ اس کا ثبوت کہاں ہے کہ وہ حکم پہلے نازل ہوا تھا اور چار والا بعد میں۔ مہربانی فرما کر اس پر مفصل روشنی ڈالیں۔

(۱۲) ایک مرد کے مقابلہ میں دو عورتوں کی شہادت اس کے برابر کیوں رکھی گئی ہے۔ درانحالیکہ عورت اور مرد میں عقلی اور ذہنی مطابقت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ آپ مرد کے تفوق میں یہ دلیل دیتے ہیں کہ مرد کمائی کرتے ہیں اور عورتیں اس کی کمائی پر منحصر ہیں۔ حالانکہ فی زمانہ بعض عورتیں نہ صرف مردوں سے زیادہ ہی کماتی ہیں۔ بلکہ بال بچوں کی پرورش بھی کرتی ہیں۔ اب آپ کی اس بارہ میں کیا رائے ہے۔

(۱۳) جب منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے کسی ایک مرد کو حق نکاح حاصل ہے۔ تو منہ بولی ماؤں سے کیوں ان کا حق نکاح باقی نہیں رکھا گیا۔ جیسا کہ نبیؐ کی بیویوںؓ کے بارہ میں ہے۔ حالانکہ نبیؐ کی بیویاںؓ بھی مسلمانوں کی احتراماً مائیں قرار دی گئی ہیں۔ اصلی مائیں تو اُن کی بھی وہی ہیں۔ جنہوں نے ان کو جنم دیا۔ اس یک بام و دو ہوا کا مطلب کیا ہے۔ واضح فرما کر مشکور فرمادیں۔

(۱۴) کسی مرتد کے اس دنیا اور آخرت میں اعمال کس طرح ضائع ہو جاتے ہیں۔ ایک مرتد ارتداد سے قبل ایک ناجائز بچہ پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ یا کوئی رفاہ عامہ کا کام کرتا ہے۔ یا کئی آدمیوں کو مسلمان بنانے کا ذمہ دار ہے۔ اور بعد میں مرتد ہو جاتا ہے۔ تو اس کے یہ افعال کس طرح ضائع ہو جاتے ہیں جبکہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ کہ اس کی بنائی ہوئی مسجد۔ چاہ۔ شفاخانہ۔ پل وغیرہ بدستور کام دے رہے ہیں تو ضائع کس طرح ہوتے ہیں مہربانی فرما کر اس حکم پر مناسب روشنی ڈال کر مشکور فرمادیں۔

(۱۵) قرآن مجید میں متعدد بار آتا ہے۔ کہ اہل کتاب یعنی عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاتھ میں جو کتب الٰہی ہیں وہ ان کی تصدیق کرتا ہے۔ درانحالیکہ ان کتب کو قرآن مجید محرف قرار دیتا ہے اور اُن کے احکام کو ناقابلِ اتباع قرار دیتا ہے۔ پھر اس کی تصدیق کا کیا حاصل ہے۔

(۱۶) حج کی تقریب پر جو لاکھوں جانور بطور قربانی ذبح کر کے ان کا گوشت زمین میں دفن کیا جاتا ہے۔ کیا یہ صریح طور پر اسراف کے تحت نہیں۔ اور قرآن مجید میں آتا ہے کہ خدا کو ان کا خون اور گوشت نہیں پہنچتا بلکہ

تقسیم یعنی ان جانوروں کی قیمت جو ادا کی جاتی ہے وہ بمنزلہ تقسیم کے ہے۔ کیونکہ درحقیقت جانوروں کے قربان ہونے کا درد تو ان کو ہی ہوتا ہے۔ جو ذبح ہو جاتے ہیں۔ قربانی کرنے والوں کو تو جو روپیہ وہ خرچ کرتے ہیں۔ اس کا ہی رنج یا تکلیف ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ اسراف کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور خدا ان کو دوست نہیں رکھتا۔ ہر ایک حاجی جو حج کر کے آتا ہے وہ ایمانداری سے اس امر کی گواہی دے سکتا ہے کہ ان جانوروں کا گوشت ضائع جاتا ہے اور بہت کم انسانوں کے کام آتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر ممالک میں مسلمانوں کے اپنے اپنے شہروں اور گاؤں میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں اس تقریب پر بلا ضرورت جانور ذبح کئے جاتے ہیں جن کی وجہ سے گوشت مہنگا ہی نہیں ہو رہا ہے بلکہ کھانے والوں کے لئے بلحاظ اصول حفظان صحت نہایت برا اثر پڑتا ہے۔ مگر پھر بھی اس فضول خرچی کو نہ صرف جاری ہی رکھا جا رہا ہے بلکہ ایسا کرنے والوں کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ کیا یہ مناسب نہیں کہ اس قسم کی قربانی کی بجائے اس کی قیمت قربانی کرنے والوں سے لے کر دیگر رفاہ عامہ کے کاموں پر خرچ کی جاوے۔ اس بارہ میں اپنی رائے عالی سے مستفید فرماویں۔

مذکورہ بالا سوالات کے جواب موصول ہو جانے پر باقی ماندہ دیگر مسائل پر جو اختلاف کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ مزید گذارش کی جاوے گی۔ والسلام

جواب (۱) قرآن کریم کی رُو سے، جو کچھ محنت سے کمایا جائے وہ جائز ہے اور جو محض سرمایہ لگا کر زائد وصول کیا جائے، وہ ناجائز ہے۔ اس اعتبار سے صرف سود ہی ناجائز نہیں قرار پاتا (خواہ بینک کا ہو یا کسی اور قسم کا) بلکہ اور بھی بہت کچھ ناجائز قرار پاجاتا ہے، جسے آجکل عام طور پر جائز سمجھا جاتا ہے اور جس کے متعلق کچھ دریافت کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ اصل یہ ہے کہ دنیا کا موجودہ معاشی نظام غیر قرآنی ہے، اس لئے سوال اس کی بعض شقوں کے متعلق نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس نظام کے متعلق ہونا چاہیئے۔ قرآن کے معاشی نظام میں، زائد از ضرورت دولت کسی کے پاس نہیں رہتی، اس لئے سرمایہ پر کچھ وصول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسری طرف اس نظام میں کسی کی کوئی ضرورت رُکی نہیں رہتی اس لئے کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج اور دست نگر نہیں ہوتا۔ اُس نظام میں بینکوں کا کاروبار بھی آج سے مختلف ہوگا اور تجارت کا نہج بھی مختلف۔

جواب (۲) اسلامی حکومت، نوع انسان کی نشوونما کے لئے جو کچھ افراد مملکت سے لیتی ہے، اُسے، قرآن کی اصطلاح میں زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔ جب اسلامی حکومت نہ ہو، تو زکوٰۃ کی حیثیت محض خیرات کی رہ جاتی ہے۔

اور حکومت کے ٹیکس اپنی جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ زکوٰۃ کے نصاب یا شرح وغیرہ کا ذکر قرآن کریم میں نہیں۔

جواب (۳) وقف علی الاولاد تو ایک طرف، قرآن کریم کی رُو سے سرے سے وقف ہی کی کوئی حیثیت نہیں۔ وقف میں مرنے والا، قیامت تک زندہ انسانوں کو، اپنے منشاء اور حکم کا پابند کر دیتا ہے، اور جو نکاح کرنے کے بعد) اُسے خود اپنے فیصلے پر نظرثانی کی بھی قدرت نہیں رہتی، اس لئے حالات کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو، وقف کا فیصلہ اٹل اور ناقابلِ تغیر و تبدل رہتا ہے۔ قرآن ایسی پوزیشن کو کب روا رکھ سکتا ہے؟ اس کے نزدیک، مردہ بدست زندہ ہوتا ہے۔ زندہ بدستِ مردہ نہیں ہوتا۔

جواب (۴) حق شفع کا قانون، قرآنی نہیں۔

جواب (۵) قرآن کریم کی رُو سے، ہر شخص کو اپنے پورے مال میں وصیت کا حق حاصل ہے، اور وہ اپنی صوابدید کے مطابق جس کے حق میں چاہے وصیت کر سکتا ہے۔ "حق" ہی نہیں، بلکہ قرآن کریم بعض صریح وصیت کرنے کو فرض قرار دیتا ہے۔ اور جہاں وراثت کے حصّوں کا ذکر کرتا ہے، واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ یہ تقسیم، وصیت پوری کرنے، اور متوفی کا قرض ادا کرنے کے بعد عمل میں آئے گی۔ یعنی جو حصّے قرآن کریم میں مذکور ہیں، ان کے مطابق تقسیم کی ضرورت صرف اس وقت ہو گی جب کسی کی وصیت اس کے پورے ترکہ کو محیط نہ ہو (cover نہ کرتی ہو) یا اتفاق سے کسی کو وصیت کرنے کا موقعہ نہ ملا ہو۔

جواب (۶) قرآن کریم میں "حلالہ" کا کوئی قانون نہیں۔ اس کا قانون یہ ہے کہ جب کسی میاں بیوی کی زندگی میں تیسری مرتبہ طلاق کی نوبت آجائے۔ یعنی ان میں ایک مرتبہ طلاق ہوئی اور انہوں نے پھر آپس میں نکاح کر لیا۔ پھر دوسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ اب اگر تیسری مرتبہ طلاق ہو گی تو ان کا باہمی نکاح نہیں ہو سکے گا۔ البتہ اگر ایسا ہو کہ مطلقہ عورت کسی دوسری جگہ نکاح کر لے، اور اس کے بعد اسے طلاق ہو جائے یا وہ بیوہ ہو جائے، تو ان سابقہ میاں بیوی کو اجازت ہے کہ اگر وہ بطیبِ خاطر، باہمی رضامندی سے چاہیں، تو آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔ اس میں صرف اجازت ہے۔ مجبوری نہیں۔ تیسری طلاق تو ایک طرف، اگر یہ پہلی طلاق کے بعد بھی باہمی رضامندی سے آپس میں نکاح نہ کرنا چاہیں، تو انہیں اس پر کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔

جواب (۷) ہم اس کی مصلحت یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کی رُو سے، تقسیم کاریوں ہے کہ بال بچّوں کی روزی مہیا کرنے کا ذمہ دار مرد ہے۔ اس لئے اُسے زیادہ حصّہ ملنا چاہیئے۔ ہاں، اگر کوئی باپ دیکھے کہ

حالات ایسے ہیں کہ بیٹی کو زیادہ ملنا چاہیئے، تو وہ اس کے لئے وصیت کر سکتا ہے۔ وہ سارا کا سارا مال بیٹی کو دے سکتا ہے۔

جواب (۸) جہیز، محض ایک رسم ہے۔ قرآن کریم میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔

جواب (۹) قرآن کریم کی رُو سے کسی کو لونڈی رکھنے کی اجازت نہیں۔ اسلام نے غلامی کو یکسر ختم کر دیا ہے۔ قرآن کریم میں جن غلاموں اور لونڈیوں کا ذکر آتا ہے، وہ، وہ ہیں جو زمانہ نزولِ قرآن کے وقت عربوں کے معاشرہ میں موجود تھے۔ قرآن کریم نے انہیں آزاد کرا دیا یا رفتہ رفتہ معاشرہ کا جزو بنا دیا، اور آئندہ کے لئے غلامی کا دروازہ بند کر دیا۔

جواب (۱۰) سب سے پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کریم کی رُو سے، ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت صرف اس صورت میں ہے جب بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کا سوال درپیش ہو۔ ورنہ اجازت نہیں۔

اب رہا عدل کا سوال۔ سو اس نے کہا ہے کہ جہاں تک، مختلف بیویوں میں جذباتی مساوات کا سوال ہے ایسا کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے اس عدل کا تقاضا نہیں کیا جا سکتا۔ جس عدل کا تقاضا ہے وہ حسنِ معاشرت، سلوک اور برتاؤ کا عدل ہے۔ یہ ممکن ہے۔

جواب (۱۱) قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کی ایک سے زیادہ ازواج مطہراتؓ کا تو ذکر ہے، لیکن ان کی تعداد مذکور نہیں۔ نہ ہی اس کی تصریح ہے کہ بیک وقت حضورؐ کے عقد میں کتنی ازواج مطہراتؓ تھیں۔ اگر بیک وقت چار سے زیادہ تھیں، تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ واقعہ چار کی تحدید سے پہلے کا ہے۔ تاریخی واقعات کے متعلق اس اصول کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ اگر تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کیا گیا ہو جو قرآن کریم کے خلاف ہے، تو ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ تاریخ کی غلطی ہے۔ اس لئے کہ ہمارا ایمان ہے کہ نبی اکرمؐ کا کوئی ارشاد گرامی یا عمل، قرآن کریم کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

جواب (۱۲) ہم اس کی مصلحت یہ سمجھتے ہیں کہ فطری طور پر عورت زیادہ جذباتی ہوتی ہے ـــــ اس کے فطری وظائف زندگی کا تقاضا تھا کہ اس کی ساخت ایسی ہو ـــــ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس خاص مقصد کے لئے دو عورتوں کی گواہی کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ اگر ان میں سے ایک (CONFUSED) ہو جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ عورت کی نفسیات کے متعلق، اس وقت تک جو ریسرچ ہمارے علم میں آئی ہے اس کی رو سے بتایا جاتا ہے کہ عورت کے لئے کسی مسئلہ کی جزئیات کو پوری پوری صحت کے ساتھ بیان کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مزید ریسرچ اس سلسلہ میں مزید معلومات بہم پہنچا دے

ہم اس مقام پر اختصار پر اکتفا کرتے ہیں، اگر آپ تفصیل چاہتے ہوں تو ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب

طاہرہ۔ کے نام خطوط۔ جلد اوّل۔ ملاحظہ فرمائیے۔

واضح رہے کہ قرآن کی رُو سے مرد کو اس بنا پر کوئی فوقیت حاصل نہیں کہ وہ کمائی کرتا ہے۔ یہ صرف تقسیم کار کا فرق ہے۔

جواب (۱۳) "منہ بولی ماؤں" سے نکاح کی ممانعت کہیں نہیں آئی۔ اگر کوئی شخص کسی ایسی عورت کو جس سے، قرآن کی رُو سے اُس کا نکاح ہو سکتا ہے، احتراماً ماں کہہ دے تو اُس سے نکاح حرام نہیں ہو جاتا۔ اگر ایسا ہو تو سینکڑوں رشتے، ناجائز قرار پا جائیں، مثلاً، ہم چھوٹی لڑکیوں کو عام طور پر بیٹی کہہ کر پکارتے ہیں۔ برابر کی عورتوں کو بہن۔ اور بڑی عورتوں کو ماں۔ اس سے وہ سچ مچ کی بیٹیاں، بہنیں اور مائیں نہیں ہو جاتیں ـــ یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص انہیں از خود اس قسم کا حقیقی درجہ دے کر ان سے عقد کا تصور نہ کرے ـــ قانونی بندش اور چیز ہے اور اپنے آپ پر بندش عائد کر لینا اور ـــ قرآن کریم نے خود اس کی وضاحت کر دی ہے کہ (مثلاً) بیوی کو ماں کہہ دینے سے وہ ماں نہیں ہو جاتی۔

نبی اکرمؐ کی ازواج مطہراتؓ سے نکاح کی ممانعت اس لئے نہیں کی گئی تھی کہ وہ مومنین کی "منہ بولی مائیں" تھیں۔ بلکہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مومنین کی مائیں قرار دیدیا تھا، اور کہدیا تھا کہ ان سے تمہارا نکاح نہیں ہو سکتا۔ یہ اس خصوصی حکم کے ماتحت تھا جس کا اطلاق دوسری عورتوں پر نہیں ہو سکتا۔ خود قرآن کریم نے حضورؐ کی ازواج مطہراتؓ کے متعلق کہا ہے کہ تم عام عورتوں جیسی نہیں ہو۔

اسلامی معاشرہ میں جو پوزیشن نبی اکرمؐ کی تھی، اسے سامنے رکھا جائے تو اس خصوصی حکم کی علت بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ وہ پوزیشن نبی کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ نہ ہو سکتی تھی، نہ ہو سکتی ہے۔ نہ ہو سکے گی۔ اس لئے قرآن کریم کے بعض احکام، حضورؐ کے لئے خاص تھے ـــ عام مومنین سے الگ۔

ضمناً عرض ہے کہ آپ نے اس سوال کے اخیر پر جو الفاظ استعمال کئے ہیں، ان میں آپ نے احتیاط سے کام نہیں لیا۔ جب خدا اور رسولؐ کے متعلق بات ہو تو گفتگو میں بڑی احتیاط برتنی چاہیئے۔

یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر قرآن کریم کے کسی حکم کی غایت یا مصلحت ہماری سمجھ میں نہ آئے تو ہمارا انداز فکر یہ ہونا چاہیئے کہ یہ ہماری کوتاہیٔ فہم یا انسانی تحقیق کی کمی ہے جس کی وجہ سے اُس حکم کی علت ہمارے سامنے نہیں آئی۔ جب ہماری معلومات میں اضافہ ہو جائے گا، یا انسانی علم اپنی موجودہ سطح سے بلند ہو جائے گا تو اُس وقت اس حکم کی غایت سامنے آجائے گی۔ قرآن کریم کے کتنے حقائق تھے جو پہلے سمجھ میں نہیں آتے تھے لیکن بعد میں، انسانی علم کی وسعت نے ان کی نقاب کشائی کر دی۔

ہم نے آپ کے سوالات کے جواب میں جہاں یہ کہا ہے کہ "ہماری سمجھ میں اس حکم کی مصلحت یہ آتی ہے" تو اگر آپ ہمارے دلائل سے مطمئن نہ ہوں تو اسے ہماری کوتاہیٔ علم پر محمول کیجئے۔ (معاذ اللہ) قرآن کا نقص نہ تصور کر لیجئے گا۔ خدا کی کتاب ہر نقص سے پاک ہے۔

جواب (۱۴) اس سوال کو ہم اچھی طرح سمجھ نہیں سکے۔ اگر ایک مسلمان، اسلام کو چھوڑ کر، کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لیتا ہے، تو اس کا شمار غیر مسلموں میں ہو جائے گا۔ اور اس سے انہی جیسا برتاؤ کیا جائے گا۔

ہمارا خیال ہے کہ آپ پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر ایک شخص مسلمان نہیں۔ یا مسلمان نہیں رہا --- تو اسے اس کے "نیک اعمال" کا بدلہ کیوں نہیں ملے گا۔ اگر آپ کا یہی سوال ہے تو ہم معذور ہیں کہ، اس کا جواب مختصراً نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے لئے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہوگا کہ ایمان کسے کہتے ہیں؟ "نیک اعمال" کی کیا تعریف ہے؟ اعمال کے بدلے سے کیا مطلب ہے؟ عمل اور ایمان میں باہمی تعلق کیا ہے؟ ایمان بلا عمل اور عمل بلا ایمان کی پوزیشن کیا ہوتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ یہ سوالات تفصیل چاہتے ہیں، اس لئے مختصراً ان کا جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اس وقت صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ انسان کا ہر عمل --- حتیٰ کہ دل کا ارادہ اور نگاہ کی خیانت تک --- اپنا نتیجہ مرتب کر کے رہتا ہے۔ اسی نتیجہ کو اس عمل کا بدلہ کہا جاتا ہے۔ اس لئے کسی عمل کے بلا نتیجہ رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن جب کہتا ہے کہ "فلاں کے اعمال رائگاں گئے" تو اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس مقصد کے حصول کے لئے اس نے وہ کام کیا تھا، اس سے وہ مقصد حاصل نہ ہوا۔ کیونکہ اس نے اس کے لئے صحیح راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ اگر کوئی شخص، غلط سڑک پر دن بھر چلتا رہے، تو اس کا یہ عمل نتیجہ تو مرتب کرے گا --- تکان۔ مسافت کا طے ہو جانا۔ راستے کی چیزوں سے باخبر ہو جانا۔ وغیرہ --- لیکن اس کا یہ عمل رائگاں جائے گا کیونکہ اس سے اس کا وہ مقصد حاصل نہیں ہوگا جس کے لئے اس نے یہ کام کیا تھا۔ یعنی وہ شام کو اپنی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچے گا۔

یہ بھی واضح رہے کہ بعض غلط کام ایسے ہوتے ہیں کہ ایک ہی کام، عمر بھر کے اچھے کاموں کو غارت کر دیتا ہے۔ مثلاً ایک شخص عمر بھر اپنی آنکھوں میں سرمہ لگاتا رہتا ہے تاکہ اس کی بینائی قائم رہے، لیکن ایک دن اپنی آنکھ میں چاقو مار لیتا ہے۔ تو اس کا یہ ایک غلط قدم، عمر بھر کے اچھے کام (سرمہ لگانے کو) غارت کر دے گا۔

جواب (۱۵) قرآن کریم نے اس کے لئے "مصدق" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کا مطلب، ان معنوں میں "تصدیق کرنے والا" نہیں جن معنوں میں ہم اسے بولتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں "سچ کر دکھانے والا"۔ اہلِ کتاب کے چند عادی رہتے۔ کچھ آرزوئیں تھیں۔ آنے والے کا انتظار تھا تاکہ وہ "خدا کی مرضی زمین پر پوری کرے"۔

حق کا غلبہ ہو۔ باطل کو شکست ہو۔ یہ باتیں ان کی محرف شدہ کتابوں میں بھی موجود تھیں۔ قرآن کریم نے ان سے کہا کہ مجھ پر ایمان لاؤ۔ میں تمہارے دعاوی کو سچ کر دکھاؤں گا اور تمہاری آرزوؤں کو پورا کر دوں گا۔ وہ آنے والا آگیا ہے۔ وہ ان سب باتوں کو عملاً سچ کر دکھائے گا۔ قرآن کے مصدق ہونے کا یہ مطلب ہے۔ (تفصیل ان امور کی "لغات القرآن" باب ص۔ د۔ ق۔ میں ملے گی)۔

جواب ۱۶ قربانی کے متعلق ہم نے، طلوع اسلام بابت جولائی ۱۹۶۱ء میں، ایک تفصیلی مقالہ شائع کیا تھا جس میں، قرآن کریم کی نصوص صریحہ کی رُو سے بتایا گیا تھا کہ جو کچھ اس ضمن میں ہمارے ہاں ہوتا ہے وہ منشائے قرآنی کے مطابق نہیں۔ طلوع اسلام کے خلاف جو آپ اس قدر شدید پراپیگنڈا دیکھ رہے ہیں اس کی ابتدا ہمارے اسی "جرم" سے ہوئی تھی۔ یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے ـــ لیکن اس سے قرآن کریم کی بیان کردہ حقیقت تو نہیں بدل سکتی۔ وہ بہرحال آشکارا ہو کر رہے گی۔ والسلام

۲۔ حرمتِ شراب

کینیڈا سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ قرآن کریم نے شراب کو حرام قرار نہیں دیا۔ اس لئے اس کے استعمال میں کیا ہرج ہے۔؟

جواب۔ قرآن کریم نے خمر (شراب) کے متعلق کہا ہے کہ وہ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ہے۔ یعنی ناپاک ہے اور شیطانی کام۔ اس کے بعد ہے فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (۵/۹۰)۔ اس سے اجتناب کرو تاکہ تم کامیاب ہو۔ اس کے بعد ہے کہ شیطان چاہتا ہے کہ خمر (اور میسرہ) سے تمہارے اندر عداوت اور بغض پیدا کر دے اور تمہیں اللہ کے ذکر اور صلوٰۃ سے روک دے۔ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ (۵/۹۱)۔ سو بتاؤ کہ تم ان سے باز رہتے ہو یا نہیں۔؟

ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ خمر کے بارے میں خدا کا منشاء اور حکم معلوم کرنے کے لئے اس سے زیادہ وضاحت کی بھی ضرورت ہے؟ قرآن کریم کی ان تصریحات کی موجودگی میں جو شخص اس کا استعمال کرتا ہے وہ خدا کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتا تو اور کیا کرتا ہے؟

قرآن کریم نے بعض چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ بعض کے متعلق کہا ہے کہ وہ اثم ہیں۔ عدوان ہیں۔ کہیں کہا ہے کہ ان چیزوں سے مجتنب رہو۔ ان کے قریب تک نہ جاؤ۔ ظاہر ہے کہ قانون کی رُو سے مختلف جرموں کی سزائیں مختلف ہوتی ہیں۔ یہ امتیازات قانونی سزاؤں کے متعلق ہیں۔ جب اسلامی ضابطہ قوانین مرتب کیا جائے تو اس وقت یہ دیکھنا ہوگا کہ فلاں جرم کو قرآن کریم نے کس درجہ میں رکھا ہے۔ اس کے مطابق

اس کی سزا مقرر کی جائے گی۔

لہٰذا، اگر قرآن کریم نے خمر کے لئے حرام کا لفظ استعمال نہیں کیا تو اس سے یہ جائز نہیں قرار پا جاتی۔ یہ ممنوع ہے اور جس چیز کو خدا نے ممنوع قرار دیا ہے اس کا استعمال، حکم خداوندی کی خلاف ورزی ہے اور اُسے جائز سمجھنا۔ قرآن سے انکار کے مراوف ہے۔

۳۔ عائلی قوانین

للہ الحمد کہ عائلی قوانین کا نفاذ ہو گیا۔ اور مظلوم طبقہ پر جو زیادتیاں صدیوں سے ہو رہی تھیں، ان کے تدارک کے لئے پہلا قدم اٹھایا گیا۔ اس سلسلہ میں ہم نے لکھا تھا کہ ان میں بعض دفعات قرآن کریم کے بالکل مطابق نہیں، اگرچہ وہ 'سابقہ قوانین کے مقابلہ میں' قرآنی منشا کے قریب ہیں۔ اکثر احباب نے ہمیں لکھا ہے کہ ان دفعات کی نشاندہی کر دی جائے، تاکہ جب ان کی ترمیم کے لئے مناسب وقت آئے تو بآسانی معلوم ہو سکے کہ انہیں قرآن کریم کے مطابق کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔

(۱) تعدد ازدواج کے سلسلہ میں ہم بتا چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رُو سے، ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت اُسی صورت میں ہو سکتی ہے جب بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی کفالت و حفاظت کا سوال درپیش ہو۔ اس کے لئے ملک میں ہنگامی حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں اور انفرادی واقعات بھی۔ قرآن کریم کی رُو سے، اس شکل کے علاوہ اور کسی صورت میں تعدد ازدواج کی اجازت نہیں۔

(۲) طلاق اور عدت کے معاملہ میں، ان قوانین میں جو طریق کار تجویز کیا گیا ہے اس میں تھوڑا سا الجھاؤ ہے۔ ان میں کہا یہ گیا ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے تو وہ اس امر کی اطلاع یونین کمیٹی کے چیرمین کو دے۔ وہ دونوں پارٹیوں کے نمایندوں کا ثالثی بورڈ بنائے اور پھر طلاق کا فیصلہ ہو۔ یہ کارروائی ۹۰ دن کے اندر ختم ہو جائے۔ اس دوران میں، میاں بیوی چاہیں تو ایک دوسرے کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

قرآن کریم کی رُو سے، طلاق اُس وقت ہو گی جب مصالحتی کوششوں کے بعد، متعلقہ اتھارٹی فیصلہ کر دے کہ میاں بیوی کی علیحدگی ناگزیر ہے۔ اس طرح طلاق ہو جانے کے بعد، عدت شروع ہو گی۔ (طلاق سے پہلے عدت شروع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا)۔ عدت کے دوران، عورت کسی اور مرد سے نکاح نہیں کر سکتی۔ اپنے سابقہ خاوند سے کر سکتی ہے، بشرطیکہ طلاق تیسری بار کی نہ ہو۔ لہٰذا، یونین کونسل کو "طلاق دینے کے ارادہ" کا نوٹس دینا چاہیئے نہ کہ "طلاق دینے" کے بعد نوٹس۔ (طلاق تو یہ شخص از خود دے ہی نہیں سکتا۔ اگر وہ بیوی سے طلاق۔ طلاق۔ کہہ بھی دے، تو بھی یہ طلاق کے ارادہ کا اعلان ہو گا، طلاق نہیں ہو گی۔) یونین کونسل

کے لئے نوّے دن کی شرط غیر ضروری ہے وہ جلد از جلد ضروری کارروائی کرے۔ جب وہ طلاق کا فیصلہ دے تو پھر عدّت شروع ہو۔

(۳) بیوی کو طلاق کا حق تفویض کرنا، یا اس کا خُلع کا مطالبہ کرنا، قرآن کے مطابق نہیں۔ قرآن کریم کی رُو سے، طلاق کے مطالبہ کا، میاں بیوی دونوں کو یکساں حق حاصل ہے اور دونوں کے لئے وہی قاعدہ ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

اگر ان قوانین کی جزئیات میں ان خطوط کے مطابق ترمیم کر دی جائے، تو ہماری بصیرت کے مطابق، یہ قرآن کے مطابق ہو گا۔

اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جس حالت میں ہمارا معاشرہ ہے، وہاں سے، قرآن کریم کے منتہیٰ تک پہنچنے میں وقت لگے گا اور یہ تبدیلی بتدریج ہو گی۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس تبدیلی میں ہمارا قدم قرآن کریم کے منتہیٰ کی طرف اٹھتا ہے یا اس کی مخالف سمت جاتا ہے۔ حکومت کا یہ پہلا قدم، اُس منزل کی طرف اُٹھا ہے جس کے لئے ہم اُسے درخورِ مبارکباد سمجھتے ہیں، اور امید رکھتے ہیں کہ وہ اسی طرح، بتدریج قوم کو، زندگی کے ہر گوشے میں، قرآنی منزل کی طرف لیجانے کے اقدامات کرے گی۔ ان کے اس پہلے مبارک اقدام کی تقلید دیگر مسلم ممالک میں بھی شروع ہو گئی ہے۔ چنانچہ اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ عراق میں نیا عائلی قانون شائع ہوا ہے جس کی رُو سے، شادی کے لئے ۱۸ سال عمر کی حد مقرر کر دی گئی ہے۔ اور شرعی عدالت کی منظوری کے بغیر ایک سے زائد شادیاں کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ (نوائے وقت [illegible])

ایک قدیمی، مخلص، قرآنی رفیق کی جُدائی

بزمِ پشاور کے نمائندہ، محترم مرزا علی احمد صاحب بصد تاسف اطلاع دیتے ہیں کہ "ایک نہایت دیرینہ، مخلص، قومی کارکن، طلوعِ اسلام کے شیدائی، اور قرآن حکیم کے پیغام کے نقیب، ڈاکٹر یوسف علی، پروپرائٹر وقیم میڈیکل ہال، ۲۳ جولائی کی شب، حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔ مرحوم ساری عمر خدمتِ خلق کے کاموں میں عملاً شرکت کرتے رہے۔ جب صوبہ بہار میں مسلمانوں پر مظالم توڑے گئے ہیں تو ڈاکٹر صاحب، ایک میڈیکل وفد میں وہاں پہنچے۔ اسی طرح محاذِ کشمیر پر مجروحین کی طبی امداد کے لئے گئے۔ اپنے مطب میں بھی نادار مریضوں کا علاج مفت کرتے رہے۔" دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

(ادارہ طلوعِ اسلام)

ربیع الاوّل کے ماہِ مبارک میں حیاتِ نبی اکرمؐ کی یاد تازہ کرتے ہوئے

اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھیئے کہ

حضور رسالتمآبؐ کی سیرتِ طیّبہ قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے

اس لئے

اس ذاتِ اقدس و اعظم کی حیاتِ مقدسہ کا وہی نقشہ قابلِ اعتماد قرار پائے گا

جسے قرآن کریم کی روشنی میں ترتیب دیا گیا ہو

معراجِ انسانیت

اسی اندازِ ترتیب کی ایک گرانمایہ پیشکش ہے

جس میں کسی مقام پر بھی تاریخی روایات کے دھندلکوں کو قرآنی حقائق کی تابناکیوں پر اثر انداز نہیں ہونے دیا گیا

نفیس ولایتی کاغذ - بہترین کتابت و طباعت - دیدہ زیب گرد پوش - مضبوط اور خوبصورت سنہری جلد - بڑے سائز کے نوسو صفحات پر مشتمل ضخیم کتاب - قیمت ۲۰ بیس روپے -

بہت تھوڑی جلدیں باقی ہیں اور اس قدر عظیم و ضخیم کتاب کی از سرِ نو طباعت و اشاعت کا اہتمام جلد ممکن نہیں ہو گا

اسلئے جلد از جلد حاصل کر لیجئے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷ - بی شاہ عالم مارکیٹ - لاہور

علم اور عقل کی روشنی میں

قرآن کریم کو سمجھنے کیلئے، پرویز صاحب کی کتابوں سے بہتر آپکو کوئی لٹریچر نہیں مل سکے گا۔ ہمارے زمانہ میں انکی یہ کوشش منفرد ہے۔ مثلاً

اسلامی معاشرت — بچوں۔ عورتوں۔ کم تعلیمیافتہ لوگوں کیلئے زندگی کے روزمرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کریم کے احکام۔ قیمت -/۲/۸

نظام ربوبیت — قرآن کا معاشی نظام، جو سرمایہ دارانہ نظام اور کمیونزم، دونوں کو مٹا کر ایک جداگانہ معاشرہ قائم کرتا ہو۔ قیمت -/۴

من و یزداں — خدا پر ایمان کے کیا معنی ہیں؟ خدا کا قرآنی تصوّر کیا ہے؟ انسان اور خدا کا تعلق کیا ہے؟ قیمت -/۱۰

ابلیس و آدم — انسان کی پیدائش کا آغاز۔ قصۂ آدم کا مطلب۔ ابلیس۔ شیطان۔ جن۔ ملائکہ۔ وحی۔ رسالت کا قرآنی مفہوم۔ -/۸

جوئے نور، برق طور، شعلۂ مستور — حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت عیسٰیؑ تک کے انبیائے کرامؑ اور ان کی قوموں کی سرگذشت۔ تاریخ کے عبرت انگیز حقائق۔ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب۔ ہر جلد -/۶

معراج انسانیت — سیرت نبی اکرمؐ قرآنی آیات کی رُو سے مرتب کردہ — ۹۰۰ صفحات پر مشتمل بڑے سائز کی کتاب۔ قیمت بیس روپے

سلیم کے نام خطوط — ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق جس قدر سوالات پیدا ہوتے ہیں، ان کا اطمینان بخش جواب، موجودہ زمانے کی علمی تحقیقات کی روشنی میں۔ عجیب و غریب مجموعہ۔ تین جلدوں میں۔ پہلی جلد کی قیمت:- آٹھ روپے۔ دوسری جلد کی قیمت:- چھ روپے۔ تیسری جلد -/۶

طاہرہ کے نام خطوط — عورتوں کے متعلق سوالات کے جوابات۔ قرآن کریم کی روشنی میں۔ دو جلدوں میں۔ اوّل -/۲۔ دوم -/۸/۲

انسان نے کیا سوچا؟ — دو ہزار سال کی انسانی فکر کی تاریخ۔ کیا تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے۔ دنیا کی کسی زبان میں اس قسم کی کتاب نہیں ملے گی۔ قیمت:- بارہ روپے

لغات القرآن — قرآن کریم کے تمام الفاظ کے معانی اور اس کے تصورات کا مفہوم، مستند کتب لغت اور قرآن کریم کی رُو سے۔ اٹھارہ سو صفحات پر مشتمل انسائیکلوپیڈیا۔ چار ضخیم جلدوں میں۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت، پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد بارہ روپے

(محصول ڈاک بذمہ خریدار)

ملنے کا پتہ:-

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷-بی شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

عیسائیت
کیوں پھیل رہی ہے؟

کچھ عرصہ سے پاکستان کے مذہبی حلقوں میں، یہ موضوع بڑی دلچسپی اور گرم سخنی کا مرکز بن رہا ہے کہ پاکستان میں عیسائیت بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ اس کا کچھ تدارک کرنا چاہیئے۔ اخبارات میں اس پر تند و تیز مقالات شائع ہوئے ہیں۔ مختلف مراکز میں اس پر گرما گرم بحثیں ہوئی ہیں۔ نقطۂ مسئلہ یہ ہے کہ عیسائیت، جو دینی حیثیت سے اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتی، پاکستان جیسے ملک میں، جہاں حکومت بھی مسلمانوں کی ہے، اس تیزی سے پھیل کیوں رہی ہے؟ اس کے اسباب و علل کے متعلق طرح طرح کی باتیں ہو رہی ہیں۔ کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ۔ لیکن اصل حقیقت کی طرف کسی کی نگاہ نہیں جاتی۔ یہ حقیقت، نہایت مختصر الفاظ میں، اس چھوٹے سے مقالہ میں، اُبھر کر سامنے آجاتی ہے جو مئی ۱۹۶۱ء کے ریڈرز ڈائجسٹ میں

لوریٹو کی داستان

کے عنوان سے، پادری جارج ویسٹ واٹر، کے قلم سے شائع ہوا ہے۔ ہم اس مقالہ کا اردو ترجمہ درج ذیل کرتے ہیں، تاکہ ہمارے مقدس مذہبی پیشواؤں کو معلوم ہو جائے کہ عیسائیت اس قسم کے مبلغین کی خارہ شگافی اور کوہ شکنی کی وجہ سے پھیل رہی ہے، اور اس کی مدافعت مسجد کے حجروں اور مکتب کے گوشوں میں بیٹھ کر نہیں کی جا سکتی۔

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت "لہو ترنگ" ہے، غافل! نہ "جل ترنگ"

اب ملاحظہ کیجئے، عیسائیت کے مذہبی پیشوا، پادری جارج ویسٹ واٹر کی داستان۔

نومبر ۱۹۵۵ء کی چودہ تاریخ تھی جبکہ میں نے اپنا مختصر سا ساز و سامان ایک جیپ میں رکھا اور کراچی سے چھ سو میل دور، ملک کی بالائی سمت میں، صحرائے تھل کی طرف روانہ ہو پڑا۔ یہ ریگ زار، پاک پنجاب کے عین قلب میں واقع ہے۔ میری منزل مقصود ایک بستی تھی ——— اس قدر چھوٹی اور نوآباد سی بستی کہ نقشے پر اس کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ اس بستی کا نام لوریٹو تھا اور اسے ایک دن ایشیائی زندگی کے ایک جرأتمندانہ اور نوآغاز تجربے کا جزو بننا تھا۔

اس صحرا کو دریائے سندھ کے پانی سے سیراب کرنے کے لئے حکومت پاکستان نہری نظام کا ایک وسیع سلسلہ مکمل کر چکی تھی۔ لوریٹو کی اراضیات ایک فارم قائم کرنے کے سلسلے میں ڈھائی صد کے قریب کیتھولک مسیحیوں کو دے دی گئی تھیں اور مجھ جیسا غیر ملکی ان کا پادری مقرر ہوا تھا۔ میں اس آتش فشاں بیابان سے گذر رہا تھا اور میرے ذہن میں سہانے خواب بسے ہوئے تھے ——— ایک سکول ہوگا۔ ایک ہسپتال اور گرجا گھر اور ان کے گرد چاروں طرف گندم کی سنہری فصلیں لہلہا رہی ہوں گی ——— ہاں! اس ریگ زار کی شادابیاں ایک دن لوریٹو کو اپنی آغوش میں لے لیں گی۔

لیکن بہت جلد میری ان خوش فہمیوں کی حقیقت سامنے آرہی تھی۔ لوریٹو کو دیکھنے سے قبل ہی میں ذہن میں اس کا تصور جما رہا تھا کہ بادسموم کا ایک بدبودار جھونکا مجھ سے ٹکرایا اور میرے لئے یہ باور کرنا مشکل ہو گیا کہ ایسی ہوا کسی انسانی آبادی سے بھی آسکتی ہے۔ پھر میں نے لوریٹو کو دیکھا اور مجھے اس کا یقین کرنا پڑا کہ ہوا کا جھونکا اسی بستی سے آیا ہے۔

لوریٹو کے اس "نخلستان" میں پانی کا صرف ایک دستی نلکا (ہینڈ پمپ) ریت کے اندر نصب تھا۔ اس کے گرد کچھ کچی مٹی کی جھونپڑیاں تھیں جن پر چھپر پڑے تھے۔ ہر جھونپڑی میں آٹھ دس افراد پر مشتمل کنبہ آباد تھا اور اس کے ساتھ ہی گائے اور کچھ جنگلی مرغیاں بھی۔ گوبر اور بول و براز کی غلاظت جگہ جگہ بکھری ہوئی تھی۔ نلکے کا پانی نہانے تک کی ضرورت پوری کرنے سے معذور تھا۔ ایندھن قریب الختم تھا۔ لوگوں کے کپڑے چیتھڑوں میں بدل چکے تھے۔ کیا ناقابل فہم ربط باہمی میں جکڑے ہوئے یہ انسان واقعی بیسویں صدی کے مسیحی ہیں؟ کیا یہی ہے میرا کلیسائی حلقہ؟

میرے دل میں مشن انسٹی ٹیوٹ کے زمانۂ تعلیم کی یاد تازہ ہو گئی۔ میں نے دفتری نظام، حفظانِ صحت، قانون کی تعلیم اور تھوڑی بہت مقامی زبان، اردو، سیکھ لینے کے بعد یہ خیال کر لیا تھا کہ اپنی ذمہ داریوں سے

اچھی طرح عہدہ برآ ہو سکوں گا۔ لیکن اب میں حیران و سرگرداں تھا۔

میں نے ان لوگوں کا جائزہ لیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ معاملہ محض افلاس اور پستی کا نہیں بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ بخار سے تمتماتے ہوئے چہروں سے انہوں نے مجھے دیکھا لیکن وہ حقیقی زندگی سے محروم تھے ——— وہ ملیریا کا شکار تھے۔

میں ان کے درمیان بیٹھ گیا اور ان سے پوچھنا شروع کیا کہ ان پر کیا گذری؟ ان کے کھیت کہاں ہیں؟ آبپاشی کی نہریں کدھر ہیں؟ ان میں سے ایک دیہاتی آگے بڑھا اور بتایا کہ اس کا نام متاب ہے ——— وہ ہری کا بیٹا ہے۔ اور وہ مجھے نہر دکھانے لے جائے گا۔ کوئی سو گز کا فاصلہ طے کر کے ہم وہاں پہنچ گئے۔ یہ نہر شمالاً جنوباً حد نگاہ تک خشک پڑی تھی۔ سیلاب اس کا ایک کنارا دور تک بہالے گیا تھا اور ابھی تک اس کی مرمت نہیں ہوئی تھی۔ لوگوں کی ترستی نگاہیں پورے دو سال سے پانی کا انتظار کر رہی تھیں اور پانی نہیں آیا تھا۔ پانی کے بغیر وہاں کچھ بھی ممکن نہ تھا۔ فصلوں، سکول، ہسپتال، گرجا گھر غرضیکہ کسی چیز کی امید باقی نہیں تھی۔ میں غربت اور مشکلات سے نبرد آزمائی کے لئے تیار تھا۔ لیکن مایوسیوں کا سامنا کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور خدا سے فریاد کی کہ وہ مجھے ان لوگوں کی خدمت کی توفیق دے۔

گاؤں میں واپسی پر میں نے اپنی قیام گاہ کا رخ کیا۔ چھپر کی یہ جھونپڑی قدرے الگ واقع تھی۔ جونہی میں نے اپنا سوٹ کیس کھولا، مریض آنے شروع ہو گئے۔ انہیں مجھ سے اپنی صحتیابی کی امید تھی اور میرے پاس اسپرین کی دو بوتلوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ میں نے یہ تھوڑی تھوڑی کر کے انہیں دینی شروع کی۔ ابھی میں اپنی چٹائی پر بمشکل لیٹا تھا کہ پاؤں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ اور اس کے ساتھ رونے کی آواز بھی۔

باہر ایک بوڑھی عورت اپنی ننھی سی بیمار بچی کو لئے کھڑی تھی۔ آنسو بہاتے ہوئے اس نے بچی کو میری طرف بڑھا دیا، ننھے مریض کے جسم کی تپش سے میری چمڑی جھلس سی گئی۔ میں اسے اندر لے گیا اور اسپرین کے آخری قطرے اس کے حلق میں انڈیل دیئے۔ عالم یاس میں اسے بچانے کی آرزو سینے میں لئے، میں رات بھر اس کے پاس بیٹھا رہا۔ ایسا نظر آتا تھا کہ اگر یہ مریضہ بچ گئی تو میری امیدوں کے لئے ایک نیک شگون ثابت ہوگا۔ لیکن مجھے ناکامی ہوئی ——— علی الصباح بچی نے دم توڑ دیا۔

بیس میل دور ایک گاؤں میں سرکاری ڈسپنسری تھی۔ میں اپنی ناکامی کے جوش میں، اڑتا ہوا وہاں پہنچا۔ طب کی ایک چھوٹی سی کتاب، انجکشن لگانے کی سرنج اور ملیریا، نمونیہ، اور تپ محرقہ کی دواؤں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کچھ معیاری دوائیاں حاصل کیں۔ بستی میں واپس پہنچ کر میں نے انجکشن لگانے کی مشق کی۔ یہی نہیں بلکہ زخم سینے

میں بھی میں نے اچھی مہارت پیدا کرلی۔

لیکن دوائیوں سے زیادہ حفظان صحت کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میں نے بزور حکم دیا کہ گائیں اور بھیڑیں کھیتوں میں باندھی جائیں اور مرغیوں کو جھونپڑیوں سے باہر رکھا جائے۔ میرے ان غیر معمولی احکام نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا لیکن انہوں نے تعمیل کی۔ وہ اس حد تک مایوسیوں کا شکار ہو چکے تھے کہ بلا چون وچرا ہدایت کو قبول کر لیتے۔

لیکن ایک حقیقت، جس سے میں اور وہ سب بخوبی آگاہ تھے، یہ تھی کہ پانی کے بغیر مستقل طور پر کچھ بھی تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس سلسلے میں، میں اپنے حلقہ کے اوورسیئر سے ملا۔ لیکن اس نے بتایا کہ اس کی ذمہ داری اپنے تیس میل کے نہری حلقہ کے انتظام سے زیادہ نہیں۔ اسے اس سے کوئی واسطہ نہیں کہ نہر کیوں خشک پڑی ہے۔ پھر میں ڈویژنل افسر سے ملا اور اس سے معلوم ہوا کہ معاملہ لیہ ڈویژن کے ایگزیکٹو انجینیر سے متعلق ہے۔ میں اس کے ہاں حاضر ہوا تو اس نے صبر کی تلقین کی۔ آخر الامر میں نے چوٹی کے افسر، سپرنٹنڈنگ انجینیر، کا، جو سو میل دور ملتان میں متعین تھے، شرف باریابی حاصل کیا۔ میں نے متاب کو بھی، جو پہلے پہل مجھے نہر پر لے گیا تھا، اپنے ساتھ لیا۔ اس تیس سالہ جوان میں، جو اس سے قبل برطانوی فوج میں رہ چکا تھا، مجھے ایک مقامی قائد کی خصوصیات نظر آئیں۔

متاب نے مذکورہ افسر کو بتایا کہ دو سال قبل اپنے بیوی بچوں سمیت وہ حکومت کے اس وعدے پر اعتماد کرکے اپنا گھر بار چھوڑ کر بیابان میں آ آباد ہوا تھا کہ اُسے پانی مہیا کیا جائے گا۔ اور پھر یہاں آکر کس طرح وہ اپنا تمام اندوختہ کھا پی بیٹھے۔ یہ حقیقت کہ اس کا خاندان اور بستی کے دیگر افراد ابھی کیونکر زندگی کے سانس لے رہے ہیں اس امداد کی مرہون منت ہے، جو گندم، خشک دودھ، اور وٹامنز کی صورت میں امدادی محکموں کی طرف سے دستیاب ہوتی رہی۔ پھر متاب نے گندم اور نشیکر کی کاشت کے بارے میں اپنی معلومات بیان کیں۔ ایک کاشتکار کی حیثیت سے نفع بخش زندگی کی تعمیری امنگوں کا ذکر کیا اور پھر ان مایوسیوں کی وضاحت کی جو پانی کے فقدان سے پیدا ہوئیں۔

چار دن بعد یہ سپرنٹنڈنٹ ہماری بستی میں تشریف لائے۔ انہوں نے نہر کا بغور معائنہ کیا اور اس کے بعد فرمایا۔

> مقدس باپ! میں کوئی دو سو آدمی سرکاری کام سے ہٹا کر، اس کام کے لئے متعین کر رہا ہوں تاکہ نہر کی مرمت از سر نو تکمیل پا سکے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگست میں آپ کو پانی مل جائے گا۔

کس قدر سرور انگیز تھی یہ خبر! کلیسائی حلقہ کے پادری کی حیثیت سے، میں نے متاب اور چار دیگر افراد پر مشتمل

ٹاؤن کونسل کی تشکیل کی۔ ہم نے گلی کوچوں کا نیا نقشہ ترتیب دیا۔ مکانات اور ان کے ساتھ سکول، ہسپتال اور گرجا گھر کی نشان زدگی کی۔ یہ سب کاغذی کارروائی تھی لیکن جلد ہی ان خاکوں کو محسوس و مشہود عمارتوں کی صورت اختیار کرنا تھا۔

متاب کو اس ریگستان میں ایک ایسی جگہ معلوم تھی جہاں مٹی اور پانی کے امتزاج سے اینٹوں کے لئے مناسب گارا تیار کیا جا سکتا تھا۔ اس نے لکڑی کا ایک سانچہ تیار کیا۔ اس میں گیلی مٹی بھری اور اُسے دھوپ میں رکھ دیا ـــ اب ایک عمارتی اینٹ ہمارے سامنے تیار پڑی تھی۔ گاؤں کے ہر فرد کو ہدایت کی گئی کہ وہ بھی یہی طریق کار اختیار کرے۔ جونہی ایک کنبہ حسب ضرورت اینٹیں تیار کر لیتا پوری آبادی مل کر اُس کے مکان کی تعمیر میں لگ جاتی۔

اور پھر ماہ اگست پانی کی نوید لیئے آ گیا۔ ہم سب نہر کے کناروں پر دو رویہ کھڑے تھے۔ جونہی گدلے پانی کی لہر ہمارے سامنے سے رواں دواں گذرتی ہم جوشِ مسرت سے تالیاں پیٹتے۔ اور پھر پانی کی لہریں چھوٹے چھوٹے سوتوں میں تقسیم ہو کر ہمارے منتظر کھیتوں کا رُخ کر لیتیں۔ جب پانی خشک ریت کو سیراب کرتا تو ہم محسوس کرتے کہ ہماری اپنی پیاس بھی بجھ گئی۔ ہم میں ایک نئی تر و تازگی عود کر آئی اور ہم ایک دوسرے پر مسکراہٹیں بکھیرنے لگے۔

ایک سال کے اندر اندر لورینٹو کی بستی میرے خوابوں کی جیتی جاگتی تعبیر بن گئی۔ اب ہر کنبے کا اپنا مکان تھا۔ ان میں سے بعض نے اپنی دیواروں کو مختلف سبزیوں کی بیلوں سے آراستہ کر لیا۔ متاب نے اپنے کھیتوں کی مٹی کو محفوظ رکھنے کے لئے ان کے گرد درخت لگا دیئے۔ دوسروں نے بھی اس مثال کی پیروی کی۔ لوگوں نے ہماری امدادی سیونگ مشین سے سلے ہوئے صاف ستھرے لباس پہن رکھے تھے۔ اور گلیاں گوبر اور بول و براز سے صاف نظر آتی تھیں کیونکہ ہر فرد اپنی اس بستی پر فخر محسوس کر رہا تھا۔ ان کے کھیت لہلہاتی فصلوں سے مالا مال تھے۔

۱۹۵۹ء کے موسم بہار میں حکومت پاکستان نے اعلان کیا کہ حلقہ دار کونسلوں کے نمایندوں کے چناؤ کے لئے مقامی طور پر انتخابات عمل میں لائے جائیں گے۔ مقصد بنیادی جمہوریت کی عملی تشکیل تھا۔ یہ ایک نیا لائحۂ عمل تھا ـــــ ایک ایسا اقدام جو حکومت خود اختیاری کے سلسلے کو پست ترین دیہاتی سطح تک بروئے کار لے آئے۔ ہر دیہاتی کو، خواہ وہ تعلیم یافتہ ہو یا ان پڑھ، یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ اپنی مقامی انتظامیہ کونسل کے ارکان کا انتخاب کرے اور اس کے بعد یہ کونسلیں تدریجاً اپنی بالائی کونسلوں کا انتخاب عمل میں لائیں۔

وزیر اعظم (مراد صدر ایوب ہیں) پاکستان نے واشگاف طور پر یہ اعلان کیا تھا کہ "بنیادی جمہوریت" سے ملک کی بہترین امیدیں وابستہ ہیں۔ اور اگر یہ تجربہ کامیاب ہو گیا تو اس سے سر زمین ایشیا کے کروڑوں انسانوں میں

زندگی کی نئی لہر دوڑ جائے گی۔

یہ سنتے ہی میں نے بلا تاخیر متاب کے گھر کا رُخ کیا تاکہ انتخابات کے سلسلہ میں اس سے مشورہ کروں۔ اب اس کے لئے واضح امکان پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اس نمائندگی کا اہل ثابت کرے۔ لیکن میرے لئے یہ مقام حیرت تھا جب اس نے صاف طور پر کہہ دیا کہ

مقدس باپ! میں امیدوار بننے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔

اپنے مکان کے گرد پھیلی ہوئی فصلوں کی طرف اشارا کرتے ہوئے اس نے کہا۔

میں اپنا منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہوں۔ اب میں ان کھیتوں کا مالک ہوں۔ میرے بیوی بچے موجود ہیں۔ مجھے اپنی مسرت کا سامان حاصل ہے۔ تو پھر میں سیاسیات میں کیوں الجھوں؟

جواباً میں نے کہا۔

اس لئے کہ تم ایک لیڈر ہو۔ ایک لیڈر کی خصوصیات سے بہرہ ور ہو۔ اور اس لئے بھی کہ اس بستی کو تمہاری نمائندگی کی ضرورت ہے۔

لیکن اس کا جواب یہ تھا کہ

مقدس باپ! میرے نزدیک یہ صورت نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس بستی کو جس چیز کی اشد ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ کھیتوں میں پوری جانفشانی سے کام کیا جائے۔

ہم رات گئے تک ایک دوسرے کو بدلائل قائل کرنے میں کوشاں رہے۔ میں نے اسے یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ اس پر پاکستان اور لورٹیو کی طرف سے ہی یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی بلکہ اپنے ان تینوں بچوں کی طرف سے بھی جن پر اسے ناز ہے۔ متاب یہ سب کچھ بغور سنتا' جوابی دلائل پیش کرتا اور پھر بغور سنتا رہا۔ آخر اس ریگ زار کی خاموشیوں کے سناٹے میں، میں اسے اپنی چھوٹی سی ڈیوڑھی میں بیٹھے چھوڑ کر چلا آیا۔

اگلی صبح متاب مجھے ملنے آیا اور اس نے اعلان کیا کہ وہ انتخابات میں بطور امیدوار کھڑا ہوگا۔ میں نے اس جذبۂ مسرت سے، کہ ایک مضبوط حکومت خود اختیاری کے لئے ہم نے بہت بڑا معرکہ سر انجام دیا ہے، اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں سمیٹ لیا۔

لیکن میری یہ مسرت شاید قبل از وقت تھی۔ آئندہ چند ہفتوں میں جو صورت حال سامنے آئی وہ میرے لئے بڑی تشویش انگیز تھی ——— لوگ متاب کی مخالفت پر اُتر آئے۔ دوسروں کے مقابلے میں اس کی فصلوں کی بہترین نشوونما بجائے اس کے کہ قابلِ تحسین قرار پاتی بغض وعناد کا سامان بن گئی۔ ٹاؤن کونسل کے عدالتی فیصلوں میں

اُس کی عدل و انصاف کے تقاضوں کی پوری شدت سے بجا آوری کی بنا پر اسے کوسا جانے لگا۔ اس کا جذبۂ مفاخرت اور دیدہ دلیری قابلِ مذمت بن گئی۔ یہ سب کچھ ناقابلِ فہم اور ناقابلِ یقین تھا۔

اس پورے عرصہ میں متاب چٹان کی طرح خاموش رہا۔ اُس کی بیوی نے اُسے سترصنین کے جواب پر اُکسایا۔ لیکن اس نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ بخوبی سمجھتا تھا کہ بستی کا ہر فرد اس کی رگ رگ سے واقف ہے اس لئے اس کا اپنے بارے میں کچھ کہنا کسی نئی چیز کا انکشاف نہیں بن سکتا تھا۔ اگر لوگ اسے اپنی نمایندگی کا اہل نہیں سمجھتے تو انہیں اس کا حق حاصل تھا۔

انتخاب کا دن آگیا اور اس کے ساتھ ہی صورتِ حال سرتاپا بدل گئی۔ اور جب رائے شماری کے نتائج سامنے آئے تو متاب بلا مقابلہ کامیاب تھا۔ میں نے ان نتائج سے یہ اخذ کیا کہ میں نے محض واقعات کو سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہے۔ جمہوری نقطۂ نظر سے لوگوں کو یہ حق اور مقام حاصل ہے کہ وہ اپنے نمایندوں پر نکتہ چینی کریں اور ایسا کرنے کے بعد وہ یقیناً بہترین نمائندے کے انتخاب کے قابل ہوں گے۔ یہی چیز جس نے میری غلط فہمیوں کو جنم دیا فی الحقیقت صحتمندانہ سیاسیات کا بہترین مظہر تھی۔

آیندہ موسم بہار میں مجھے لوریٹو سے رخصت ہو جانا تھا کیونکہ میرا کام ختم ہو چکا تھا۔ میری جگہ ایک دوسرا پادری پہنچ گیا تھا۔ تعلیمی سلسلے میں تین راہبات (NUNS) اور ایک نرس بھی پہنچ گئی تھی۔ گرجا گھر، سکول اور حفظانِ صحت کی عمارتیں مکمل ہو چکی تھیں۔ لوگ مسرت کے جھولے جھول رہے تھے کیونکہ اب وہ خود کفیل ہو چکے تھے۔

یہ لوگ میری کشتِ امید کی ثمر باریوں کا حصہ تھے اور بوقتِ رخصت ان کا سامنا کرنا میرے بس سے باہر تھا۔ میں یقیناً اس موقع پر رو پڑتا۔ چنانچہ میں مناسب موقع کا منتظر رہا۔ اور جب رات نے اپنے ڈیرے ڈال دیئے تو میں اپنی جیپ میں سوار ہوا اور اسی سمت روانہ ہو پڑا جہاں سے تین سال قبل میں یہاں آیا تھا۔

کوئی ایک میل فاصلہ طے کرنے کے بعد میں رک گیا۔ میں نے انجن کو بند کر دیا اور نگہ بازگشت لوریٹو کی جانب اُٹھ گئی۔ دور فاصلے پر بستی کے چراغوں کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ آبپاشی کی نہر کا زندگی بخش پانی ہرے ملائم اور دھیمے دھیمے سروں میں گنگنا رہا تھا۔ ایام رفتہ کی مایوسی اور بے یقینی پر میرے دل میں ندامت کا احساس اُبھر آیا۔ یہ لوگ مجھ سے کہیں بڑھ کر عزم و ہمت کے دھنی تھے۔ بیماری اور غربت نے انہیں حیوانی سطح زندگی پر لا کھڑا کیا تھا۔ لیکن اس سے وہ حیوان نہیں بن گئے تھے۔ ان کی شخصیت خدا کے عطا فرمودہ جوہر انسانیت سے محروم نہیں ہوئی تھی۔ میں نے یہاں سے وہ سبق حاصل کیا جسے میں کبھی فراموش نہیں کروں گا۔ نوعِ انسانی کی مضمر صلاحیتوں اور طلب خیر کے متعلق میں آئندہ کبھی غلط فہمی کا شکار نہیں بن سکوں گا۔

[آیا سمجھ میں آپ کی کہ عیسائیت کیوں پھیل رہی ہے۔؟ طلوع اسلام]

یورپ
ایشیا
مراکش
تیونس
الجیریا
لیبیا
مصر
موریطانیہ
فرانسیسی مغربی افریقہ
سوڈان
گولڈ کوسٹ
نائیجیریا
فرانسیسی استوائی افریقہ
شمالی
روڈیشیا
بحر ہند

مغربی افریقہ عہدِ اسلامی میں

[افریقہ کو "تاریک براعظم" کہا جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک، باہر کی دنیا اس کے حالات سے بالعموم بے خبر تھی۔ اب وہاں جو سیاسی تحریکیں رونما ہوئی ہیں ان کی وجہ سے اکثر علاقوں کے حالات سے بیرونی دنیا باخبر ہو رہی ہے۔ لیکن وہاں (مصر کے علاوہ باقی علاقوں میں) اسلام کب پہنچا۔ مسلمانوں کی حکومتیں پہلے پہل کب قائم ہوئیں۔ تاریخ میں ان حکومتوں کا کیا مقام ہے۔ وہاں کے باشندوں نے علم و تہذیب میں کیا ترقی کی۔ یہ سوالات ایسے ہیں جن کے جوابات ابھی تک تاریکی کی چادر میں لپٹے ہوئے ہیں۔

ماہنامہ ثقافت (لاہور) کی اپریل ۱۹۶۱ء کی اشاعت میں محترم ثروت خاں صاحب کے قلم سے، عنوان بالا کے تحت، ایک معلوماتی مقالہ شائع ہوا جس میں مغربی افریقہ کی قدیم اسلامی مملکتوں کے حالات روشنی میں لائے گئے۔ ہم اس مقالہ کو، ثقافت کے شکریہ کے ساتھ، درج ذیل کرتے ہیں۔ امید ہے قارئین طلوعِ اسلام اسے مفید پائیں گے۔]

(طلوعِ اسلام)

مغربی افریقہ رقبہ کے لحاظ سے ایک طویل و عریض خطہ ہے۔ اس جگہ جس علاقے کی تاریخ پیش کرنا مقصود ہے وہ صحرائے اعظم اور اس کے جنوب کا وہ حصہ ہے جو، چند ماہ قبل تک، فرانسیسی مغربی افریقہ کہلاتا تھا۔ اور اب جہاں مالی، سنیگال، گنی، نائیجیریا، اور دوسری آزاد ریاستیں قائم ہو چکی ہیں۔ عربی کی قدیم تاریخوں میں یہ خطہ بلاد سودان کے نام سے مشہور تھا۔ یہ اصطلاح در اصل اس تمام خطے کے لئے مخصوص تھی جو بحیرۂ احمر سے لے کر بحرِ اوقیانوس تک پھیلا ہوا ہے، اور جس میں زنگی نسل کے سیاہ فام باشندے آباد ہیں۔ دریائے نیل والے

سوڈان سے فرق کرنے کے لئے 'خطہ زیر بحث کو مغربی سوڈان بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن اب یہ اصطلاح صرف تاریخی اور جغرافیائی اہمیت رکھتی ہے' ورنہ آج کل اس پورے خطہ کے لئے مغربی افریقہ کی اصطلاح عام ہے اور مغربی سوڈان' یا سابق فرانسیسی سوڈان' کا لفظ اس نو آزاد جمہوریہ کے لئے مخصوص ہو گیا ہے جو مالی اور سینیگال کے وفاق میں شامل کیا گیا تھا۔

نائجر اور سینیگال اس خطہ کے دو سب سے بڑے دریا ہیں۔ مغربی افریقہ کا جو حصہ ان دریاؤں کے جنوب میں واقع ہے اس کا بیشتر حصہ زرخیز اور شاداب زمینوں پر مشتمل ہے۔ جنوب کے ساحل کے ساتھ ساتھ' ہزاروں میل کا علاقہ' بارش کی کثرت کی وجہ سے' سدا بہار گھنے جنگلوں سے پٹا پڑا ہے۔

اس خطہ میں لوہے' تانبے' مینگنیز' المونیم اور دوسری دھاتوں کی بھی کثرت ہے۔ عہد قدیم میں یہاں کے بعض حصوں سے اس کثرت سے سونا حاصل کیا جاتا تھا کہ اس کی شہرت عرب ملکوں سے نکل کر یورپ تک پہنچ گئی تھی۔ یہ خیال عام تھا کہ یہ سونا کانوں سے نہیں نکلتا[1] بلکہ درختوں میں لگتا ہے۔ انگلستان کا مشہور سکہ گنی اس وجہ سے گنی کہلایا کہ وہ سب سے پہلے علاقہ گنی کے سونے[2] سے تیار کیا گیا تھا۔ مغربی افریقہ میں سونا اور قیمتی دھاتیں اب بھی پائی جاتی ہیں۔

یہاں کے باشندے سوائے بربروں کے' جو زیادہ تر صحرائے اعظم کے علاقہ میں آباد ہیں' تمام کے تمام سیاہ فام یا حامی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور بے شمار قبیلوں میں منقسم ہیں۔ جس قدر قبیلے ہیں زبانیں بھی تقریباً اتنی ہی بولی جاتی ہیں۔ اگر کوئی افریقی زبان مشترکہ یا عام زبان کی حیثیت رکھتی ہے تو وہ ہوسا زبان ہے جو اسی نام کے ایک قبیلہ کی زبان ہے۔ لیکن اس قبیلے کی بیشتر تعداد نائجیریا میں آباد ہے اور مغربی افریقہ میں ہوسا باشندے صرف تجارتی مرکزوں میں پائے جاتے ہیں۔ ہوسا زبان عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور اب نائجیریا سے اس زبان میں متعدد اخبار اور رسالے بھی شائع ہونے لگے ہیں۔

مسلمانوں کے علمی حلقوں میں عربی بھی سمجھی اور پڑھی جاتی ہے۔ عہد قدیم میں مغربی سوڈان میں جو بھی کتاب لکھی جاتی تھی وہ عربی ہی میں ہوتی تھی۔ آج کل تعلیم یافتہ طبقہ کی مشترکہ زبان فرانسیسی ہے اور مغربی افریقہ کی کئی ریاستوں میں فرانسیسی کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے۔

---

[1] معجم البلدان' یاقوت حموی دیکھیے - مترجم

[2] Golden Trape of Moors از بوول' ص ۱۱۹

مغربی افریقہ کے قبائل

مغربی افریقہ کی آبادی بے شمار قبیلوں اور خاندانوں میں منقسم ہے۔ یہ قبیلے سوائے ان بربر قبیلوں کے جو صحرائے اعظم میں آباد ہیں، تقریباً تمام کے تمام سیاہ فام نسل کے سودانی باشندوں پر مشتمل ہیں۔ ان سودانی قبیلوں میں سب سے بڑا قبیلہ مندنگو (Mandingo) ہے۔

مندنگو نسل کے باشندے جن کو میندے (Mande) بھی کہا جاتا ہے، زیادہ تر بالائی نائجر، بالائی سنیگال اور گنی میں فوتا جلون (FUTA JALLON) کی سطح مرتفع کی مغربی ڈھلانوں پر آباد ہیں۔ ویسے مندنگو قبائل، دریائے نائجر کے شمالی خم سے لے کر گیمبیا (GAMBIA) تک، ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ مندنگو قبیلے لائبیریا، سیرالیون اور آئیوری کوسٹ کے شمالی حصوں میں بھی آباد ہیں۔ ان کی مجموعی آبادی تیس لاکھ ہے۔

مندنگو کو مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ بالعموم یہ نام ان خاندانوں اور قبیلوں کے ہیں جن میں اس نسل کے باشندے تقسیم ہو گئے ہیں۔ مثلاً دریائے نائجر کے شمالی خم سے گھرے ہوئے علاقے میں وہ واکور (WAKORE) یا ونگارا (WANGARA) کہلاتے ہیں۔ دریائے سنیگال سے گیمبیا تک ساحلی علاقے میں جو مندنگو قبیلے آباد ہیں وہ، ولف (WOLOF) اور سیرس (SERES) کہلاتے ہیں۔ ایک اور مشہور مندنگو قبیلہ بمبارا ہے جو موجودہ جمہوریہ سوڈان کے دارالحکومت، بماکو میں، اور اس کے مشرق اور مغرب میں آباد ہے۔ دریائے نائجر کے معاون دریائے بانی کے مشرق میں "جولا" کا مندنگو قبیلہ آباد ہے۔ عام طور پر مندنگو نسل کے باشندوں کو فولانی نسل کے باشندے، مالنکی (MALENKE) اور موسا باشندے ونگارا کہتے ہیں۔ سنیگال میں اور دریائے نائجر کے بالائی حصہ میں سارا کولے (Sarakolle) اور سوننکے (SONINKE) کے نام سے جو قبیلے آباد ہیں وہ بھی مندنگو ہی ہیں۔ مندنگو کی تاریخ مغربی افریقہ میں سب سے زیادہ شاندار ہے۔ غانہ کی قدیم غیر مسلم حکومت، اور اس کے بعد مالی کی اسلامی مملکت اسی نسل کے باشندوں کی حکومتیں تھیں۔ پچھلی صدی عیسوی میں مغربی افریقہ کے مشہور مصلح اور رہنما حاجی عمر تجانی اور امام صمدؤ جو سموری کے نام سے مشہور ہیں، اسی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ آج کل جمہوریہ مالی کے صدر مودیبو کیتا (MODIBO KIETA) اور گنی کے صدر شیخ توری مندنگو ہی ہیں۔ اوّل الذکر کا تعلق بمبارا قبیلے سے ہے اور وہ مالی کی قدیم اسلامی مملکت کے مشہور خاندان کیتا سے تعلق رکھتے ہیں اور ثانی الذکر امام صمد کی اولاد میں ہیں۔ مندنگو کی اکثریت مسلمان ہے۔

مغربی افریقہ کا دوسرا اہم قبیلہ فولا (FULA) ہے۔ اس کا ذکر کتابوں میں فولانی اور پیول (PEUL) کے ناموں سے بھی آتا ہے۔ ان کی تعداد بائیس لاکھ کے قریب ہے۔ یہ زیادہ تر گنی میں آباد ہیں، جہاں ان کی تعداد آٹھ لاکھ[1] سے زیادہ ہے۔ ویسے فولانی باشندے پورے مغربی افریقہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن نائجیریا اور گنی کے علاقے تو نابجلوں میں ان کو سیاسی برتری بھی حاصل ہے۔ اگرچہ ان کا عام پیشہ گلہ بانی ہے لیکن مغربی افریقہ کے بڑے حصہ میں مذہبی سیادت فولانیوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔ منگو پارک نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ "پیغمبر اسلام کے احکام اور قوانین ان کے درمیان ہر جگہ احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں"۔

فولانیوں کی قبل از اسلام کی تاریخ قطعی تاریکی میں ہے۔ لیکن اسلام لانے کے بعد فولانیوں نے بکثرت نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ فولانی طبعاً حلیم اور نرم خو واقع ہوئے ہیں۔ لیکن وہ خود کو عام سودانی یعنی سیاہ فام باشندوں سے برتر سمجھتے ہیں۔ یا کم از کم منگو پارک کا ایسا ہی خیال تھا (سفر نامہ ص ۴۴) فولانی مغربی افریقہ میں تقریباً سب کے سب مسلمان ہیں۔

مغربی افریقہ کے دوسرے اہم قبائل حسب ذیل ہیں۔

ماسی (MASSI)، جو زیادہ تر بالائی والٹا میں آباد ہیں، انہوں نے گذشتہ صدیوں میں مسلمانوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا۔ جس کی وجہ سے اسلام ان میں زیادہ نفوذ نہیں کر سکا۔ یہ زیادہ تر غیر مسلم ہیں۔

تکرور — یہ قبیلہ سینیگال میں آباد ہے اور اس کی تعداد ڈھائی لاکھ سے زیادہ ہے۔ اس کو تکلور بھی لکھتے ہیں۔ سب سے پہلا سودانی شاہی خاندان جس نے اسلام قبول کیا تکلوری تھا۔

سونگھائی — یہ قبیلہ ٹمبکٹو کے جنوب مشرق میں دریائے نائجر کی وادی میں آباد ہے۔ اس کا مرکز گاؤ کا شہر ہے جو مالی کی موجودہ مملکت میں واقع ہے۔ قدیم عربی کتابوں میں اس شہر کا نام کوکو لکھا جاتا تھا۔ یہ قبیلہ اگرچہ ڈھائی لاکھ سے زیادہ نہیں لیکن سولہویں صدی کے اوائل میں اس قبیلہ نے مغربی افریقہ میں ایک ایسی عظیم السلطنت قائم کر دی تھی جو اپنی وسعت میں مالی کی سلطنت سے بھی زیادہ پھیلی ہوئی تھی اور جس کا حکمران محمد اسکیائے اعظم اپنی صلاحیت اور تدبر کے لحاظ سے تاریخ اسلام کے بہترین حکمرانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ سونگھائی قبیلہ نے گیارہویں صدی میں اسلام قبول کیا تھا اور وہ سب مسلمان ہیں۔

سودانی نسل کے باشندوں کے علاوہ مغربی افریقہ میں تقریباً چار لاکھ بربر باشندے بھی آباد ہیں۔ ان کا سامی

---

[1] تاریخ نائجیریا (انگریزی) از سر ایلین برنس اور (TRAVELS OF MUNGO PARK) مطبوعہ ۱۹۵۴ء

[2] فرانسیسی مغربی افریقہ ۱۹۵۸ء (Statesman year Book)

نسل سے تعلق ہے اور یہ زیادہ تر صحرائے اعظم اور ادرار میں، جسے آجکل موریطانیا کہا جاتا ہے، آباد ہیں۔ یہ بربر بھی متعدد قبیلوں اور خاندانوں میں تقسیم ہیں۔ مغربی افریقہ میں ان کا سب سے بڑا قبیلہ ترقتہ (TUAREG) ہے۔ منہاجہ مسوفہ، لمتونہ اور جدالہ دوسرے قبیلے ہیں جو یا تو ترقتہ کی شاخیں ہیں یا مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔

غانہ کی سلطنت

ٹمبکٹو کے ایک مورخ عبد الرحمٰن سعدی[1] کی تاریخ سوڈان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خطہ کی سب سے قدیم سلطنت غانہ کی تھی۔ ابن حوقل کے نقشہ میں اسے "غانۃ الکفر" لکھا گیا ہے۔ اس سلطنت کا افریقہ کے موجودہ ملک غانا سے، جسے عام طور پر اردو میں گھانا لکھا جا رہا ہے، کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ غانہ کی قدیم سلطنت کی حدود بڑی حد تک وہی تھیں جو کچھ عرصہ قبل مالی فیڈریشن کی تھیں۔ ممکن ہے کہ موجودہ غانا کا شمالی حصہ اس کی حدود میں آتا ہو لیکن یہ طے ہے کہ اس سلطنت کی حدود جنوبی ساحل تک وسیع نہیں تھیں۔[2]

غانہ کی سلطنت کے اولین حکمران سیاہ فام زنگی نسل سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ وہ سفید نسل کے باشندے تھے۔ غالباً وہ بربر ہوں گے جو سامی النسل ہیں۔ غانہ میں سنہ ہجری سے پہلے بائیس حکمراں ہو چکے تھے اور اتنے ہی اس کے بعد ہوئے۔ مغربی سوڈان پر عربوں کے حملے سے پہلے، جو غالباً اموی دور کے آخر میں ہوا تھا، غانہ میں ایک زنگی قبیلہ برسر اقتدار آ گیا تھا، جو منڈنگو قبیلے کی ایک شاخ سوننکے (Soninke) سے تھا۔

مسلمانوں کا مغربی افریقہ سے تعلق اسی زنگی خاندان کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے۔ غانہ کی سلطنت پورے عروج پر نویں صدی عیسوی میں پہنچی۔ اس کا دارالحکومت کمبی (KUMBI) کا شہر تھا۔ جو ٹمبکٹو کے جنوب مغرب میں تین سو میل کے فاصلے پر آباد تھا، اور جس کے کھنڈرات اب تک موجود ہیں۔ غانہ کے شمال اور مغرب میں جو بربر قبیلے آباد تھے ان سے غانہ کی اکثر لڑائیاں رہتی تھیں۔ دسویں صدی میں ان کے صدر مقام اودغست[3] (Auoughast) پر غانہ کا قبضہ بھی ہو گیا تھا۔ یہ شہر کمبی کے مغرب میں پندرہ دن کے فاصلہ پر واقع تھا۔ اندلسی جغرافیہ دان البکری (۱۰۲۸ — ۱۰۹۴ء) نے غانہ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ یہاں کا حکمران دولاکھ

---

[1] عبد الرحمٰن عسکری سترھویں صدی کے سوڈانی عالم ہیں۔ [2] عبد الرحمٰن کی کتاب میں سنہ ۱۶۵۵ء تک مغربی سوڈان کی تاریخ ہے۔ اس کے صرف تین نسخے معلوم ہو سکے ہیں۔ ایک ٹمبکٹو میں ہے اور دو پیرس کے (Bibliotheaue Nationale) میں ہیں۔ [3] جغرافیہ کی عربی کتابوں میں یہ نام آودغست اور اوزغست بھی لکھا جاتا رہا ہے۔

فوج میدان میں لا سکتا تھا جس میں چالیس ہزار تیر کمان سے مسلح ہوتے تھے۔

کمبی کا شہر مغربی سوڈان کی سب سے بڑی تجارتی منڈی تھا۔ یہ جگہ غلاموں کی تجارت کا بھی بڑا مرکز تھی۔ یہ غلام زیادہ تر مردم خور قبیلوں سے آتے تھے۔ جن کو عرب لملم، دمدم، اور نیام نیام کے ناموں سے پکارتے تھے۔

غانہ کے مغرب میں سنیگال کی طرف تکرور کی حکومت تھی۔ غانہ کے سوننکے باشندوں کی طرح تکرور بھی تجارت پیشہ تھے۔ یہ لوگ غلاموں اور سونے کی تجارت کے علاوہ نمک کی تجارت بھی کرتے تھے جو سنیگال دریا کے دہانہ میں واقع ایک جزیرہ سے حاصل ہوتا تھا۔ تکرور گھٹیا قسم کا کپڑا بھی بناتے تھے۔

گیارھویں صدی میں لمتونہ قبائل کے عروج پر غانہ کا زوال شروع ہو گیا۔ لمتونہ نے سب سے پہلے ۱۰۵۴ء میں اپنا صدر مقام اودغست غانہ سے واپس لے لیا اور اس کے بعد ۱۰۷۶ء میں دارالحکومت کمبی پر بھی قبضہ کر لیا۔

غانہ میں اسلام کی اشاعت

اموی دور کے آخر میں مسلمان الجزائر اور مراکش پر قبضہ کرنے کے بعد ۷۳۴ء اور ۸۰۰ء کے درمیان، جنوب میں بجلماسہ اور تغازہ پر قابض ہو چکے تھے۔ بجلماسہ صحرائے اعظم میں شمال کی طرف سے داخلہ تھا اور تغازہ جنوب کی طرف جانے والے راستہ پر شمال کی آخری چوکی تھی۔ تغازہ کی اہمیت زیادہ تر نمک کی کانوں کی وجہ سے تھی۔ ان کانوں سے غانہ کے لوگ فائدہ اٹھاتے تھے۔ غالباً تغازہ پر عربوں کے قابض ہونے کے بعد ہی سے مسلمانوں کی غانا میں تجارت کی وجہ سے آمد و رفت شروع ہو گئی۔

لیکن اسلام غانہ سے پہلے ان بربر قبائل میں پھیل چکا تھا جو غانہ کے شمال اور مغرب میں اس علاقہ میں آباد تھے جو آجکل موریطانیا کہلاتا ہے۔ شمالی افریقہ کے بربر بنی امیہ کے آخری دور ہی میں اسلام لا چکے تھے۔ بعد میں یہی بربر مسلمان جنوب کے غیر مسلم بربروں اور سیاہ فام باشندوں میں اشاعتِ اسلام کا باعث ہوئے چنانچہ دسویں صدی عیسوی (چوتھی صدی ہجری) میں بربر عام طور پر مسلمان نظر آتے ہیں۔ چوتھی صدی ہجری میں جب ابن حوقل صحرائے اعظم کو پار کر کے ملتونہ کے صدر مقام اودغست گیا تو نہ صرف یہ کہ وہاں کثیر تعداد میں عرب تاجر آباد ہو چکے تھے بلکہ وہاں کے مقامی[1] باشندے بھی مسلمان تھے۔

---

[1] یاقوت حموی کی ایک تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ اودغست اور گرد و نواح کے باشندے چوتھی صدی کے آغاز میں خلافت فاطمیہ کے بانی عبید اللہ مہدی کے زمانہ میں مسلمان ہوئے تھے۔ اس سے پہلے وہ سورج کی پرستش کرتے تھے خون اور مردہ کھاتے تھے۔ یاقوت نے لکھا ہے کہ اب یہ لوگ قرآن اور فقہ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور مسجدوں میں نماز با جماعت ادا کرتے ہیں (معجم البلدان لفظ اودغست)

ابن حوقل نے لکھا ہے کہ :-

اودغست میں پانی افراط سے تھا جس کی وجہ سے طرح طرح کی فصلیں کھجور، گیہوں، باجرہ انجیر، انگور اور دوسری فصلیں پیدا ہوتی تھیں، مویشی اور بھیڑوں کی کثرت تھی اور ارزاں تھیں۔ شہر سونے کی تجارت کی منڈی تھا جو سوڈان سے آتا تھا اور "مزب" کو خصوصاً بحلماسہ کو جاتا تھا۔ شہد بھی سوڈان سے آتا تھا۔ خشک پھل تانبا اور کپڑا شمال سے آتا تھا۔

تجارت اتنے وسیع پیمانے پر ہوتی تھی کہ بحلماسہ کا ایک شخص یہاں کے تاجر کا چالیس ہزار دینار کا مقروض تھا۔ لوگ کافی دولتمند تھے اور عیش و آرام کی زندگی گزارتے تھے۔

بڑا شہر تھا۔ عمارتیں عمدہ تھیں اور چاروں طرف کھجور کے درختوں کی کثرت تھی۔ باشندے بربر تھے جو زنگی غلاموں کے مالک تھے۔ یہاں عربوں کی ایک بڑی تعداد تجارت کرتی تھی۔

یہ شہر اپنے باورچیوں کی مہارت اور گوری عورتوں کے حسن کی وجہ سے مشہور تھا۔ ان عورتوں کے کولھے خاص طور پر بہت خوبصورت ہوتے تھے۔ یہ عورتیں کروٹ سے لیٹا کرتی تھیں تاکہ ان کے کولھے دبنے کی وجہ سے بدنما نہ ہو جائیں۔

یہی زمانہ ہے کہ ان بربروں میں مرابطین کی مشہور اصلاحی تحریک شروع ہوئی۔ ماریٹانیا کے بیشتر بربر قبائل اگرچہ دسویں صدی عیسوی ہی میں مسلمان ہو چکے تھے لیکن اسلامی تعلیم کے اثرات ان پر بہت ہلکے تھے چنانچہ گیارھویں صدی عیسوی کے دوسرے ربع میں قبیلہ صنہاجہ کا ایک سردار، یحییٰ بن ابراہیم براہ قیروان اور بحلماسہ اپنے وطن واپس آیا تو وہ اپنے ساتھ بحلماسہ کے ایک پرجوش معلم اور مبلغ عبداللہ بن یسین کو بھی اپنے ہمراہ لایا تاکہ وہ ان بربروں کی اسلامی انداز پر تربیت کر سکیں۔

بربروں کو تربیت دینے کے کام میں عبداللہ بن یسین کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ بربر صرف نام کے مسلمان رہنا چاہتے تھے۔ نظم و ضبط اور تنظیم سے گھبراتے تھے۔ عبداللہ بن یسین نے جب ان کو سختی سے اسلامی اصول پر چلانا چاہا تو ان بربروں نے، جو جدالہ اور لمتونہ قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے، ان کے گھر میں آگ لگا دی اور ان کو اپنے علاقہ سے نکال دیا۔ اب عبداللہ بن یسین نے اپنے دو لمتونی پیروؤں کے ساتھ دریائے سنیگال کے ایک جزیرہ میں پناہ حاصل کی۔ اور وہاں ایک رباط یا خانقاہ قائم کر لی۔ یہ رباط جلد ہی گرد و نواح کے علاقوں میں

تبلیغِ اسلام کا ایک بڑا مرکز بن گئی۔ کہا جاتا ہے کہ سینیگال میں تکرور کا شاہی خاندان پہلا زنگی یعنی سوڈانی خاندان ہے جو اسلام لایا۔ اس کے بعد ان بہت سے سوڈانی باشندوں نے بھی اسلام قبول کر لیا جو غانہ کے کم و بیش باجگذار تھے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سوڈانی باشندوں نے غانہ کی سیاسی برتری ختم کرنے کے لئے اسلام کو ایک بڑا ذریعہ سمجھا۔ اس لئے[1] کہ ہم دیکھتے ہیں کہ سینیگال کے تکرور باشندوں کے مسلمان ہوتے ہی مشرق کی طرف دریائے نائجر کی وادی میں جس کی ریاستیں غانہ کی باجگذار تھیں، اسلام تیزی سے پھیلنا شروع ہو گیا اور سوڈانیوں کے قبیلے کے قبیلے مسلمان ہونے لگے۔ مالی اور سونگھائی کے حکمران خاندان بھی اسی زمانہ میں مسلمان ہوئے۔

عبد اللہ بن یسین نے اپنی تبلیغی مہم کا آغاز ۱۰۴۲ء میں کیا تھا۔ اگلے بارہ سال میں، اس مہم نے اتنی قوت حاصل کر لی کہ عبد اللہ بن یسین تیس ہزار منظم فوج میدانِ جنگ میں لانے کے قابل ہو گئے۔ یہ فوج کوئی بے ترتیب اور کوئی غیر ذمہ دار انبوہ نہیں تھا بلکہ ضابطے اور قوانین کی پابند ایک منظم فوج تھی۔ ایک مغربی مصنف نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ:-

"اس فوج میں وہی جوش و خروش تھا جو ان کے راہ نماؤں میں تھا۔ کچھ تعداد گھوڑ سوار اور اونٹ سوار تھی۔ لیکن بیشتر تعداد پیدل تھی۔ یہ لوگ نیزوں اور کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔ اگرچہ کل تک وہ صبر و ضبط کے عادی نہیں تھے۔ لیکن اب وہ دورِ جدید کی فوج کی طرح نظم و ضبط کے پابند ہو چکے تھے۔ وہ اپنی صفوں میں انتشار نہیں آنے دیتے تھے۔ اور نہ وہ شکست خوردہ دشمن کا تعاقب کرتے تھے۔ افریقہ نے، اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد، کبھی ایسی پر عزم فوج[2] دیکھی۔

مرابطین نے اس فوج کے ذریعہ، جو بربر اور زنگی دونوں نسل کے باشندوں پر مشتمل تھی، مغربی صحرا میں سینیگال سے بحلاسہ تک ایک مضبوط حکومت قائم کر دی۔ ۱۰۵۴ء میں انہوں نے لمتونہ کا صدر مقام اودغست بھی غانہ سے چھین لیا۔ اس فتح کے تین سال بعد عبد اللہ بن یسین، جبکہ وہ مغرب اقصیٰ کی تسخیر میں مصروف تھے، ۱۰۵۸ء میں ایک جنگ میں کام آ گئے۔ ایک مغربی مصنف نے لکھا ہے کہ:-

"ان کی موت سے تاریخ افریقہ کی ایک عظیم شخصیت اس دنیا سے اٹھ گئی۔ وہ زبردست تحریک، جو انہوں نے شروع کی تھی، ان کی موت کے وقت تک ایک ایسی سلطنت کی

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ مقالہ "سوڈان"۔

[2] The GOLDEN TRADE OF THE MOORS مصنف E. BOVIL ص ۶۲۔

شکل اختیار کر چکی تھی جو تقریباً تمام مغربی صحرا، سوس، اغمات، بجلماسہ اور گرد و نواح کے زرخیز اضلاع پر مشتمل تھی۔

عبداللہ بن یٰسین کے بعد ابوبکر مرابطین کے امیر مقرر ہوئے۔ انہوں نے شمال کی کمان اپنے چچازاد بھائی مشہور زمانہ یوسف بن تاشفین کے سپرد کر کے خود ۱۰۶۲ء میں صحرا کا رُخ کیا۔ بربر قبائل کو، جو عبداللہ بن یٰسین کی موت کے بعد پھر آپس میں لڑنے لگے تھے، ایک بار پھر متحد کیا اور ان کی توجہ کو باہمی جھگڑوں سے دور رکھنے کے لئے ان کا رُخ غانہ کے کفار کی طرف پھیر دیا۔ اس مہم میں ان کے ساتھ تکرور کی نومسلم مملکت کی فوج بھی شامل تھی۔

غانہ کی مملکت اگرچہ زیادہ تر غیر مسلم باشندوں پر مشتمل تھی اور حکمران خاندان بھی غیر مسلم تھا لیکن گیارھویں صدی میں شمال اور مغرب میں تیزی سے اسلام پھیل جانے کی وجہ سے غانہ میں اسلام کے اثرات بہت بڑھ گئے تھے۔ اور خود غانہ کے سیاہ فام باشندوں میں اسلام تیزی سے پھیل رہا تھا۔ اندلسی سیاح اور جغرافیہ دان البکری (۱۰۲۸ — ۱۰۹۴) نے مرابطین کے حملے سے قبل غانہ کے دارالحکومت کمبی کے حالات لکھتے ہوئے بتایا ہے کہ:

کمبی دو حصوں پر مشتمل تھا جو ایک دوسرے سے چھ میل دور تھے۔ ایک حصہ مسلمانوں کے لئے مخصوص تھا جہاں بارہ مسجدیں تھیں اور جن میں فقہا کا اجتماع ہوتا تھا۔ دوسرا حصہ الغابہ (جنگل) کہلاتا تھا۔ یہ حکومت کا مرکز تھا اور بے دین آبادی یہیں رہتی تھی۔

گھر بیشتر مٹی کے تھے جن کی چھتیں گھاس پھوس کی تھیں۔ لیکن بعض عمارتیں پتھر کی بھی تھیں۔

غانہ کی حکومت میں مسلمان بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ خزانچی، ترجمان اور وزیر بالعموم مسلمان ہوتے تھے۔ بادشاہ کے سامنے بے دین لوگ جھکتے تھے اور اپنے سروں پر خاک ڈالتے تھے۔ لیکن مسلمان صرف تالیاں بجاتے تھے۔"

غانہ کے دارالحکومت کمبی کو مرابطین نے امیر ابوبکر کی زیر قیادت ۱۰۷۶ء میں فتح کر لیا۔ اس طرح غانہ کی قدیم سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔

لہ THE GOLDEN TRADE OF THE MOORS مصنف E. BOVIL ص ۴۳۔

لہ غانہ اور گرد و نواح کے علاقے میں اشاعت اسلام کی تاریخ کے سلسلہ میں ڈاکٹر آرنلڈ کی کتاب (Preching of Islam) میں بڑی مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

غانہ کے زوال و خاتمہ کے بعد مغربی افریقہ کی اسلامی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ یہ باب خالص سیاہ فام سوڈانی مسلمانوں کے کارناموں کا ہے ابوبکر کا تو دس سال بعد ۱۰۸۷ء میں انتقال ہو گیا اور اس کے بعد مرابطین نو مفتوحہ علاقوں سے جلد ہی بے دخل کر دیئے گئے۔ لیکن انہوں نے اس مختصر مدت میں، جس تبلیغی جدوجہد کی بنیاد ڈال دی تھی وہ بڑی دور رس ثابت ہوئی۔ منڈنگو قبیلہ سونکے (SONINKE) جو سارا کولے بھی کہلاتا ہے۔ اب تمام کا تمام مسلمان ہو گیا اور مغربی افریقہ میں تبلیغ اسلام کی مہم کا سرخیل بن گیا۔ ان سیاہ فام مسلمانوں کی کوششوں سے ذیل کی وہ تمام سوڈانی ریاستیں[1] مسلمان ہو گئیں جو کبھی غانہ کی باج گذار تھیں۔

جارا یا کنیاگا جو موجودہ مقام نیورو (NYORO) کے پاس تھی۔ گمبو جو کبھی کے جنوب میں تھی۔ سوسو (گمبو اور مالی کی موجودہ جمہوریہ کے صدر مقام بماکو کے درمیان) اور جاکھار (مغربی سینا) وغیرہ

گیارھویں صدی کے آخر میں جاکھا کے سارا کولے مسلمانوں کی کوششوں سے جولا قبیلہ نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ ان جولا باشندوں نے، جو تجارت کے سلسلے میں جنوب میں دُور تک چلے جاتے تھے، اسلام کو موجودہ گھانا (سابق گولڈ کوسٹ) کے گھنے جنگلوں تک پھیلا دیا۔ یہ مہم کم و بیش بارھویں صدی کے آخر تک جاری رہی اور دریائے نائجر کے کنارے واقع شہر "جینی" (GENNE) کے بادشاہ کے ۱۲۰۰ء میں اسلام قبول کرنے پر ختم ہوئی۔ اس بادشاہ نے قبول اسلام کے وقت ایک زبردست جشن کیا جس میں علاقہ سوڈان کے چار ہزار دو سو علماء[2] نے شرکت کی۔ اس موقع پر بادشاہ نے اپنے محل کو مسجد میں تبدیل کر دیا۔

اس جشن میں علماء کی کثیر تعداد سے پتہ چلتا ہے کہ دریائے نائجر کے وسطی حصہ میں اسلام بارھویں صدی تک اچھی طرح پھیل چکا تھا۔ سوڈان (مغربی) یا مالی کی اکثریت اگرچہ اب بھی غیر مسلم تھی لیکن امراء، رؤساء اور شہری آبادی زیادہ تر مسلمان ہو چکی تھی اور مغربی سوڈان کی سیاست میں مسلمانوں کو ایک ایسا غلبہ حاصل ہو گیا جو آج بھی قائم ہے۔

۱۱۸۰ء میں علاقہ سوسو[3] کی مسلم مملکت کو، جو موجودہ بماکو سے ایک سو پچیس میل شمال مشرق میں واقع تھی،

---

[1] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، مقالہ سوڈان۔ [2] اشاعت اسلام (انگریزی) از آرنلڈ اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مقالہ۔ (Jenne)۔ [3] سوسو افریقہ کے مشہور منڈنگو قبیلے کی ایک شاخ کا نام بھی ہے جو اس وقت زیادہ تر جنوبی گنی میں آباد ہے۔ بعض مصنفوں نے جن میں بدول (BOVIL) بھی شامل ہے سوسو شہر کو سوسو قبیلہ سمجھ لیا ہے جو غلط ہے۔ مذکورہ بالا علاقہ سوسو کا قبیلہ سوسو سے کوئی تعلق نہیں۔

وہیں کے ایک غیر مسلم فوجی نے ختم کر دیا اور ۱۲۰۳ء میں سوسو کے نئے حکمرانوں نے کمبی پر بھی قبضہ کر لیا۔ ان غیر مسلموں نے یہاں کے مسلمانوں پر، جن کی بڑی تعداد دولتمند عرب اور سودانی تاجروں پر مشتمل تھی، ایسے مظالم کئے کہ وہ کمبی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اب انہوں نے کمبی کے شمال میں سو میل کے فاصلہ پر "ولاتا" نامی شہر آباد کیا۔ کمبی جلد ہی گوشۂ گمنامی میں چلا گیا اور ولاتا سوڈان کی سب سے بڑی منڈی بن گیا۔

مالی کا عروج

غانہ کے زوال کے بعد، اس تمام علاقے میں، جو کبھی غانہ کی سلطنت میں شامل تھا، متعدد چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ یہ ریاستیں فی الحقیقت غانہ کی باجگذار تھیں اور اب غانہ کے زوال کے بعد یہ خود مختار ہو گئی تھیں۔ انہی میں ایک مالی کی حکومت تھی۔ مالی کا علاقہ دریائے نائجر کی بالائی وادی پر مشتمل تھا۔ اور ریاست کی حدود دریائے نائجر کے دونوں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ مالی کا حکمران خاندان تحریک مرابطین کے ابتدائی دور ہی میں مسلمان ہو چکا تھا۔ ابن خلدون نے یہاں کے پہلے مسلمان حکمران کا نام برمنداںؔ لکھا ہے۔ اسلام لانے کے بعد برمنداں حج بھی کر آیا تھا۔ مورخین نے اس کے اسلام لانے کا سال[1]، ۱۰۵۰ء تعین کیا ہے۔

جس زمانہ میں سوسو یا صوصو خاندان کو عروج ہوا تو بارہ بھائی تختِ مالی کے وارث موجود تھے۔ سوسو حکمران نے ان میں گیارہ بھائیوں کو قتل کروا دیا لیکن سب سے چھوٹے یعنی بارھویں بچہ کو جس کا نام تاریخوں میں ماری جاطہ اور سندیاتا (SANDIATA) درج ہے ہلاک نہیں کیا۔ بعد میں بڑے ہو کر اسی ماری جاطہ نے سوسو کا تختہ پلٹ دیا۔ شروع میں اس نے گرد و نواح کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو فتح کیا۔ اس کے بعد ۱۲۳۵ء میں اس نے "کیری نا" کے مقام پر، سوسو کو شکست فاش دے کر، ان کے ملک پر بھی قبضہ کر لیا۔ یہ جگہ ریل کے آخری اسٹیشن موجودہ "کولی کورو" کے شمال میں واقع تھی۔

کیری نا کی جنگ کے بعد سندیاتا نے پھر کبھی جنگ میں خود شرکت نہیں کی، لیکن اس کی فوجیں بدستور فتوحات میں مصروف رہیں یہاں تک کہ تکرور اور دریائے گیمبیا تک کا علاقہ فتح کر لیا گیا اور اس طرح مالی مغربی سوڈان کی سب سے بڑی مملکت بن گئی۔ سندیاتا اپنے کارناموں کی وجہ سے آج بھی مندنگو قوم کا

---

[1] ابن خلدون نے اپنی تاریخ کی چھٹی جلد میں ص ۱۹۸ سے ۲۰۲ تک تقریباً چار صفحوں میں مالی کی مختصر تاریخ پیش کی ہے۔ اس نے یہ حالات ایک سودانی (مغربی) عالم سے سن کر لکھے ہیں جس سے ابن خلدون کی مصر میں ملاقات ہوئی تھی۔ یہ عالم حج کے سلسلہ میں مصر سے گزرا تھا۔ غالباً مالی کی تاریخ کا یہ سب سے پہلا تذکرہ ہے۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (انگریزی) مقالہ (MANDINGO)۔

ہیرو سمجھا جاتا ہے۔"

اب تک مالی کا دارالحکومت جربیہ (Jeriba) تھا لیکن سندیاتا نے قریب کی بستی نیانی (NIANI) کو دارالحکومت قرار دیا۔ بعد میں اسی مقام نے مالی کے نام سے شہرت پائی۔

سن دیاتا یا ماری جاطہ نے ۱۲۳۰ء سے ۱۲۵۵ء تک ۲۵ سال حکومت کی۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ مقامی زبان میں ماری کے معنی ہیں وہ امیر جو سلطان کی نسل سے ہو اور جاطہ کے معنی ہیں شیر۔ مالی کا یہ خاندان ۱۲۳۰ء سے ۱۵۴۴ء تک تقریباً ساڑھے تین سو سال حکمران رہا۔ ان میں شروع کے دس بارہ حکمران جن کے نام اور مدت حکومت بڑی حد تک محفوظ ہیں حسب ذیل ہیں:-

۱-	ماری جاطہ	۱۲۳۰	۱۲۵۵	
۲-	منسا اولے	۱۲۵۵	۱۲۷۰	
۳-	ابوبکر	۱۲۷۰	۱۲۸۵	اس مدت میں دلی، خلیفہ اور ابوبکر تین حکمران ہوئے۔
۴-	ساکورا	۱۲۸۵	۱۳۰۰	
۵-	ابوبکر	۱۳۰۰	۱۳۰۷	
۶-	منسا موسیٰ	۱۳۰۷	۱۳۳۲	
۷-	منسا منا	۱۳۳۲	۱۳۳۶	
۸-	منسا سلیمان	۱۳۳۶	۱۳۵۹	
۹-	ماری جاطہ ثانی	۱۳۵۹	۱۳۷۴	
۱۰-	منسا موسیٰ دوم	۱۳۷۴	۱۳۸۷	

مالی کی حکومت ماری جاطہ کی نسل میں زیادہ عرصہ نہیں رہ سکی۔ درمیان میں ایک غلام ساکورا جس کا نام

۱؎ (THE GOLDEN TRADE OF THE MOORS) ص ۸۶ اس جگہ یہ جاننا باعث دلچسپی ہوگا کہ عرب سیاح اور جغرافیہ دان جربیہ اور نیانی کے ناموں سے واقف تھے۔ وہ دارالحکومت کو بھی مالی لکھتے رہے ہیں۔ حالانکہ یہ نام صرف مملکت کا تھا۔ یہ غلط فہمی ۱۹۱۳ء تک قائم رہی۔ اس سال جب مالی ہی کے ایک مؤرخ محمود کعتی کی کتاب "تاریخ الفتاح" پہلی مرتبہ شائع ہوئی تو معلوم ہوا کہ مالی کسی شہر کا نام نہیں۔ اور مالی کا دارالحکومت پہلے جربیہ تھا۔ پھر نیانی ہوا۔ یہ شہر اب ناپید ہو چکے ہیں لیکن ان کے آثار موجود ہیں۔ دیکھئے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مقالہ (MALI)۔

ابن خلدون نے سیکرہ بھی لکھا ہے، تخت پر قابض ہوگیا۔ اس غلام نے بھی بڑی شان و شوکت سے حکومت کی، اور سلطنت کی حدود میں مزید توسیع کی۔ اس کے بعد حکومت ماری جاطہ کے بھائی کے لڑکے ابوبکر کے ہاتھ آگئی اور بعد کے تمام حکمران اسی کی نسل سے ہوئے۔

سلطنت مالی کا گل سرسبد ابوبکر کا لڑکا منسا موسیٰ (۱۳۰۷ء تا ۱۳۳۲ء) ہے۔ اس کے عہد میں مالی کی سلطنت اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ ٹمبکٹو اور گاؤ کے مشہور شہر فتح ہوئے اور سلطنت کی حدود مشرق میں گاؤ سے مغرب میں سینگال تک اور شمال میں تغازی کی نمک کی کانوں سے جنوب میں واقع گھنے جنگلوں تک وسیع ہوگئیں۔

منسا موسےٰ کا سفرِ حج

منسا موسےٰ کو سب سے زیادہ شہرت اس کے سفرِ حج[1] کی وجہ سے ہوئی۔ یہ سفر اتنا پرشکوہ تھا کہ اس کی بدولت مالی کے حکمران اور مالی کی سلطنت کی شہرت، نہ صرف اسلامی دنیا کے ایک بڑے حصہ میں پھیل گئی بلکہ، تاجروں کے ذریعہ یورپ تک اس کی شہرت ہوگئی۔

منسا موسیٰ نے یہ حج ۷۲۴ھ مطابق ۱۳۲۴ء میں کیا تھا۔ سفر پر اس طرح روانہ ہوا کہ خود گھوڑے پر سوار تھا۔ آگے آگے پانچ سو غلام تھے۔ ہر غلام کے ہاتھ میں سونے کا ایک عصا تھا جس کا وزن پانچ سو مثقال (ایک مثقال ⅛ اونس، تھا)۔ اسّی[2] سے زیادہ اونٹ، سونے سے لدے ہوئے، اس کا علاوہ تھے۔ ہر اونٹ پر تین قنطار (تین سو پونڈ) سونا تھا۔

منسا موسیٰ راستے بھر سونا برساتا ہوا گیا۔ قاہرہ میں، اس کی پارسائی اور فیاضی کی بدولت، اسے بڑی ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔ سلطان مصر نے اس کے آرام کے لئے ہر قسم کی سہولتیں فراہم کردی تھیں۔ بارہ سال بعد جب ایک مصنف قاہرہ پہنچا تو اس وقت بھی لوگ اس کی تعریف کے گن گا رہے تھے۔ عہدیداران تحفوں کا ذکر کرتے تھے جو ان کو منسا موسیٰ سے ملے۔ اس کے ساتھی ایک دینار کے کپڑے کی قیمت پانچ پانچ دینار ادا کرتے تھے۔ چنانچہ، سونے کی اس کثرت سے آمد کی وجہ سے، مصر میں سونے کی قیمت اتنی گر گئی تھی کہ بارہ سال بعد تک سابقہ قیمت بحال نہیں ہوئی۔

منسا موسیٰ نے مدینہ اور مکہ پہنچ کر اور بھی کثرت سے اخراجات کیئے۔ ان کثیر اخراجات کا نتیجہ یہ ہوا کہ حج

---

[1] منسا موسےٰ کے سفرِ حج کی تفصیلات کا واحد ماخذ العمری کی کتاب "مسالک الابصار" ہے لیکن میں نے یہ تفصیلات بورل کی کتاب (The Trade) سے نقل کی ہیں۔ [2] تاریخ ابن خلدون جلد ششم ص (۱۹۸ — ۲۰۲)۔

کرنے کے بعد جب وہ واپس قاہرہ پہنچا تو اس کا سارا سرمایہ ختم ہو چکا تھا۔ بالآخر اسکندریہ کے ایک تاجر نے اسے قرض دیا۔ یہ تاجر بادشاہ کے ساتھ ساتھ سوڈان تک گیا۔ لیکن ٹمبکٹو پہنچ کر اس کا انتقال ہو گیا۔ لیکن عادل حکمران نے اس کے وارثوں کو پورا پورا قرض ادا کر دیا۔ اسی زمانہ میں منسا موسیٰ کو خبر ملی کہ اس کے سپہ سالار سنفخہ نے سونگھائی کی مملکت فتح کر لی۔ چنانچہ منسا موسیٰ نے، سونگھائی کے دارالحکومت گاؤ پہنچ کر، وہاں کے حکمران کی اطاعت بذات خود قبول کی اور اس کے دو لڑکوں علی کولن اور سلیمان نار کو بطور یرغمال اپنے ساتھ لے گیا۔

مکہ معظمہ سے منسا موسیٰ ایک اندلسی شاعر اور معمار، ابو اسحٰق ابراہیم الساحلی، معروف بہ طویجن کو اپنے ساتھ لایا تھا۔ چنانچہ بادشاہ کے حکم سے اس نے سب سے پہلے شہر گاؤ میں ایک خوبصورت مسجد بنائی۔ یہ مسجد پختہ اینٹوں کی تھی جس کا اب تک سوڈان میں رواج نہیں تھا۔ الساحلی نے اسی طرز کی ایک مسجد ٹمبکٹو میں بھی بنائی۔ بعد میں یہ مسجدیں سوڈان میں مشرقی طرز تعمیر کی مسجدوں کے لئے ایک نمونہ بن گئیں۔ الساحلی نے ٹمبکٹو میں مسجد کے علاوہ بادشاہ کے لئے محل بھی تعمیر کیا۔

منسا موسیٰ کے زمانہ میں پہلی مرتبہ مالی کے بیرونی ملکوں سے تعلقات قائم ہوئے۔ چنانچہ مراکش کے سلطان ابوالحسن سے اس کے اچھے تعلقات تھے اور تحائف کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ جو بعد کے حکمرانوں کے زمانہ میں بھی جاری رہا۔

منسا موسیٰ درویش صفت اور نیک سیرت حکمران تھا۔ اس کے عدل کے متعدد قصے تاریخوں میں درج ہیں۔

منسا موسیٰ کے بعد اس کا لڑکا منسا مغا (MAGHA) چار سال تک حکمران رہا۔ لیکن اس زمانہ میں گاؤ کا شہر مالی کے اقتدار سے آزاد ہو گیا اور سلطنت میں کمزوری پیدا ہو گئی۔ مغا کے بعد اس کا چچا سلیمان بن ابوبکر (۱۳۳۶ء تا ۱۳۵۹ء) حکمران ہوا تو اس نے سلطنت کو پھر سے مستحکم کر دیا۔ اگرچہ گاؤ پر مالی کا پھر کبھی قبضہ نہ ہو سکا لیکن گاؤ کے شمال مشرق کا ایک بڑا علاقہ جس میں تکدا (TAKEDDA) کی بستی شامل تھی پھر سے مالی کی سلطنت کا جزو بن گیا۔ تکدا، سوڈان (مغربی) میں تانبے کی کانوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس کے علاوہ مشرق میں تجارت کا بھی بڑا مرکز تھا۔ یہاں سے ہر سال بارہ ہزار اونٹ تجارتی سامان لے کر گزرتے تھے۔

سلیمان ہی کے زمانہ میں ابن بطوطہ ۱۳۵۳ء میں سوڈان آیا۔ اس کے سفرنامے کے آخری سترہ صفحے (صفحہ ۱۸۳ سے

لہ ابن خلدون، جلد ششم، "تاریخ مالی"۔

۱۳۰۰ تک) مالی کے حالات پر مشتمل ہیں جو اس کے طویل سفر کی آخری منزل تھی۔

سلیمان کے بعد مالی کی سلطنت بتدریج کمزور ہوتی چلی گئی۔ پندرھویں صدی کے آخر میں مشرق میں سونگھائی کی بڑھتی ہوئی طاقت، شمال میں بربروں نے اور رہی سہی قوت مغرب میں تکرور قبائل کے حملوں نے ختم کر دی۔ ۱۴۸۱ء میں مالی کے حکمران منساماما دو (محمد) نے ان حملوں کو روکنے کے لئے عثمانی ترکوں سے مدد مانگی جس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

غالباً مالی کے اقتدار سے، سب سے پہلے، تکرور کا علاقہ آزاد ہوا۔ شمال کے بربر قبائل پندرھویں صدی کے آخر تک مالی کے باجگذار تھے۔ ۱۵۰۰ء کے بعد غالباً وہ بھی آزاد ہو گئے۔ ماری جاطہ ثانی (۱۳۵۹ء تا ۱۳۷۴ء) بڑا مسرف تھا۔ اس نے سونے کا وہ خزانہ بھی، جسے اس کے بزرگ فراہم کرتے آئے تھے، مصر کے سوداگروں کے ہاتھ بہت سستے داموں فروخت[1] کر دیا۔ اس کے اس اسراف نے ملک کی حالت خراب کر دی۔ اس کے زمانہ میں مراکش سے تحائف کا سلسلہ بھی قائم ہوا۔ چنانچہ اس نے تخت نشینی کے بعد مراکش کے مرینی حکمران ابا سالم کو جو تحائف بھیجے تھے ان میں زرافہ بھی تھا۔ جب یہ جانور ۱۴۶۳ء میں "فاس" پہنچا تو اس کے دیکھنے کے لئے ہزاروں افراد جمع ہو گئے تھے۔

ماری جاطہ علت النوم (sleeping Sickness) کی بیماری میں، دو سال تک بیمار رہنے کے بعد، ۱۳۷۷ء میں وفات پا گیا۔

۱۴۸۳ء میں پہلی مرتبہ، اور اس کے بعد ۱۵۳۴ء میں، پرتگال نے مالی سے سفارتی تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی اور پرتگالی سفیر اس سلسلے میں مالی آئے۔ لیکن اب مالی کی حکومت بہت کمزور ہو گئی تھی۔ ۱۵۴۵ء میں سونگھائی حکمران اسکیا داؤد نے دارالحکومت تاراج کیا۔ سو سال بعد مالی کا علاقہ مختلف چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ اور مالی کی حیثیت ایک شہری مملکت سے زیادہ نہیں رہی، جو کبھی آزاد اور کبھی گردونواح کی طاقتور ریاستوں کی باجگذار ہوتی تھی۔

ابن بطوطہ کا سفرنامہ

مالی کے عہد عروج میں وہاں کے عام حالات معلوم کرنے کا ہمارے پاس سب سے بڑا ذریعہ ابن بطوطہ کا سفرنامہ ہے۔ ابن بطوطہ ۱۳۵۲ء کے محرم میں بھلاسے

---

[1] تاریخ مراکش (انگریزی)، مصنفہ میکسن، ترجمہ مولوی انشاء اللہ خان، پیسہ اخبار۔ لاہور۔

[2] ابن خلدون جلد ششم، ص۔ ۱۹۸ - ۲۰۲، جلد ہفتم، ص ۳۱۰۔

روانہ ہو کر تین ماہ کے بعد ۱۴ جمادی الاوّل کو مالی کے دارالحکومت نیانی پہنچا۔ اس نے مالی کی مملکت میں ایک سال سے زیادہ قیام کیا اور اس دوران میں دارالحکومت کے علاوہ گاد، تکدا اور ٹمبکٹو کی بھی سیر کی وہ دلاتا (دلاطہ) سے مالی صرف تین ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہوا۔ مُلک اتنا آباد اور پُرامن تھا کہ کسی اور ساتھی کی ضرورت نہ تھی۔ یہ سفر ۴۴ دن کا تھا لیکن ابن بطوطہ نے نہ خوراک ساتھ لی اور نہ سونا چاندی۔ وہ نمک، تسبیح کے دانوں اور مسالوں کے معاوضہ میں ہر گاؤں سے خوراک حاصل کر لیتا تھا۔ نیانی پہنچ کر وہ سلیمان کے دربار میں گیا، جہاں اس نے پہلی مرتبہ مردم خور باشندوں کو دیکھا، جن کا ایک وفد اس وقت دربار میں آیا ہوا تھا۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ سودانی باشندے کئی قابل تعریف خصوصیات رکھتے ہیں۔

"وہ منصف ہیں اور دوسری قوموں کے مقابلہ میں ظلم سے نفرت کرتے ہیں۔ سلطان معمولی سے جرم کو بھی معاف نہیں کرتا۔ ملک میں مکمل امن و امان ہے۔ باشندوں اور سیاحوں کو ڈاکوؤں وغیرہ سے کسی قسم کا ڈر نہیں۔ سفید لوگوں کی جائداد کبھی ضبط نہیں کرتے اور مرنے پر وارثوں کو دیدیتے ہیں۔"

ابن بطوطہ نے سودانی باشندوں کی بعض خرابیاں بھی بیان کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ملازم عورتیں، لونڈیاں اور بچیاں ہر ایک کے سامنے بالکل برہنہ پھرتی ہیں۔ حتّٰی کہ بادشاہ کے سامنے بھی ننگی چلی جاتی ہیں۔ خود بادشاہ کی لڑکیاں نیم برہنہ رہتی ہیں۔ دربار میں بادشاہ کے احترام کے وقت سر میں خاک، دھول ڈالنے کا رواج ہے۔ لوگ کتّے اور گدھے کا گوشت بھی کھاتے ہیں۔

ابن بطوطہ نے سودانی باشندوں کے مذہبی جذبے کی بڑی تعریف کی ہے۔ مثلاً یہ کہ لوگ نماز پابندی سے پڑھتے ہیں اور جماعت ادا کرتے ہیں۔ بچوں کو بھی اپنے ساتھ مسجد میں لاتے ہیں۔ مسجدوں میں نماز کے لئے اتنا اژدھام ہوتا ہے کہ اگر دیر ہو جائے تو اندر جگہ نہیں مل سکتی۔

مندنگو باشندوں کے دینی جذبے کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ ان کے سلاطین، باوجود اس کے کہ راستے میں صحرائے اعظم حائل ہوتا تھا، حج کرنے کے لئے جاتے تھے۔ چنانچہ مالی کے پہلے حکمران برمندان کے علاوہ منسا کُورا[1] اور منسا موسیٰ کے متعلق ہمیں علم ہے کہ انہوں نے حج کیا تھا۔

(باقی آئندہ)

[1] ابن خلدون - جلد ششم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

القرآن العظیم

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

انسانی تاریخ کی عبرت سامانی

تاریخِ انسانیت پر نگاہ ڈالئے۔ یہ 'تعمیر و تخریب کی عبرت انگیز داستان' اور آبادی و ویرانی کی حدیث خونچکاں نظر آئے گی۔ ہر دور کے انسان کی جد و جہد اور سعی و کاوش کا ملخص یہ دکھائی دے گا کہ وہ اپنے لئے ایک عظیم الشان نظامِ تمدن تعمیر کرتا ہے۔ اس فلک بوس و ہمکشاں تعمیر عمارت کے لئے انواع و اقسام کے نوادرات جمع کرتا ہے۔ وہ عمارت' اُس کے حسین تصورات کی مرکز۔ اس کی شاداب آرزوؤں کی محور اور گل پوش تمناؤں کی آماجگاہ بنتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس ایوانِ رفیع الشان کی تکمیل میں ارتقائے انسانیت کا راز پوشیدہ ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا وجود دنیا کے ستائے ہوئے انسانوں کے لئے پناہ گاہ ہے جو اسے ظلم و استبداد کے پنجۂ آہنی کی گرفت سے بچا کر امن و سکون عطا کرے گا۔ وہ ایک عرصہ تک اِن تصورات کی دُنیا میں محو اور اس قصرِ عظیم المرتبت کی تکمیل و تزئین میں سرگرداں رہتا ہے' اور جوں جوں اُس کی دیواریں اوپر کو اُبھرتی ہیں' اُس کی نگاہوں میں چمک اور مسرتوں میں بالیدگی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے ـــ لیکن وہ عمارت ہنوز تکمیل تک بھی نہیں پہنچنے پاتی کہ دنیا اُس عبرت انگیز تماشے کو بصد حیرت دیکھتی ہے کہ وہی انسان' اُس عظیم و حسین عمارت کو خود اپنے ہاتھوں سے زمین پر گرا دیتا ہے' اور یوں اُس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا وہ شگفتہ و شاداب مرقع' خاک کا ڈھیر بن جاتا ہے' اور' اُس کے بعد' اُس کے کھنڈرات' ایک حسین خواب کی پریشاں تعمیر کی نشاندہی کے لئے باقی رہ جاتے ہیں۔ بابل اور نینوا۔ مصر اور یونان۔ چین اور ترکستان۔ روم اور ایران کی تہاذیب کے کھنڈرات کو دیکھئے اور پہچانئے کہ وہ کیسے کیسے عظیم المرتبت تمدنوں کے مدفن ہیں' جن میں انسانی ناکامیوں اور نامرادیوں کی تاسف انگیز اور جگر پاش داستانیں محوِ خواب ہیں ـــــ وہ داستانیں جو ہر قلبِ حساس سے پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا (۱۶/۹۲)

دیکھنا! تمہاری مثال اُس بڑھیا کی سی نہ ہو جائے جس نے بڑی محنت سے سوت کاتا اور پھر خود ہی اپنے ہاتھوں سے اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

تہذیب حاضر

اگر آپ کو تاریخ کی ان کہنہ داستانوں کی ورق گردانی اور اقوام سابقہ کے اُجڑے ہوئے کاشانوں کی عبرت سامانی سے انسانی سعی و کاوش کے اس مآل و انجام تک پہنچنے کی فرصت نہیں، تو ایک نظر خود اپنے زمانے کے قصرِ تہذیب و تمدن پر ڈالئے جس کی چمک دمک نے اقوامِ عالم کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر رکھی ہے۔ ہمارا دور تہذیب مغرب کا دور کہلاتا ہے۔ اس تہذیب کی سطوت و شروت اور دبدبہ و طنطنہ کا یہ عالم ہے کہ انسان نے فطرت کی بڑی بڑی مہیب قوتوں کو مسخر کر لیا ہے۔ اسباب رسل و رسائل اور ذرائع آمد و رفت کی محیر العقول برق رفتاری سے زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں۔ سمندر اس کے تابع فرمان ہے۔ پہاڑ اس کے حضور سجدہ ریز ہیں۔ زمین اس کے پاؤں کی ٹھوکروں سے اپنے دبے ہوئے خزانے اُگل رہی ہے۔ آسمان کی بجلیاں اس کے اشاروں پر ناچتی ہیں۔ ایٹم کی غیر مرئی جنانی توانائیاں اس کی مٹھی میں ہیں۔ وہ چاند اور سورج کو اپنے زیر دام لا رہا ہے۔ وہ کہکشاں پر کمندیں پھینکنے کی سوچ رہا ہے۔ انسان کو اپنی ساری تاریخ میں کبھی اس قدر کائنات گیر قوت حاصل نہیں ہوئی تھی۔

لیکن ابھی اس تہذیب کی عمر نصف صدی سے بھی زیادہ ہونے نہیں پائی کہ ان بے پناہ قوتوں کا حامل انسان پکار اٹھا ہے کہ

> ہم نے زندگی کی ابتدا سائنس کی کاریگری سے کی، اس وثوق کے ساتھ کہ مادی کامرانیاں زندگی کے عقدوں کو حل کر دیں گی۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم غلطی پر تھے۔ زندگی کے مسائل اتنے آسان نہیں۔[1]

بلکہ یہاں تک کہ

> ہماری موجودہ تہذیب، اپنے قومی، معاشی، عائلی، اخلاقی، مذہبی اور ذہنی نظام کے ہر شعبہ میں، حماقت، جہالت، فریب اور ظلم کا مستقل مظاہرہ ہے۔[2]

چنانچہ اس قصرِ فلک بوس کی بنیادیں بری طرح سے کھوکھلی ہو رہی ہیں، اور ہر قلب حساس متوحش ہے کہ اگر گذشتہ دو عالمگیر لڑائیوں کے بعد ایک اور دھچکا لگا، تو نہ صرف یہ کہ اس کاخِ بلند کا نام و نشان تک مٹ جائے گا بلکہ اس کے سائے کے نیچے بیٹھی ہوئی انسانیت بھی کچل کر رہ جائے گی۔

---

[1] J. W. T MASON — in — Creative Freedom.

[2] G. A. DORSEY — in — CIVILISATION

سوال یہ ہے کہ انسان کے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ دورِ قدیم کے تمدن کے

ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ ایوانات ہوں یا عصرِ حاضر کی تہذیب کے محلات، نہ انہیں پاگلوں نے بنایا تھا، نہ انہیں دیوانوں نے تعمیر کیا ہے۔ یہ نظاہائے تہذیب و تمدن، ہر دور کے انسانوں کی عقل و دانش کا ماحصل، اور ان کی تدبیری اور انتظامی صلاحیتوں کا نچوڑ تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسانیت کی تاریخ کے مطالعے کے بعد، ہر صاحبِ علم و بصیرت، لامحالہ اس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ

> ہم نے تلخ تجارب کے بعد یہ سیکھا ہے کہ معاشرتی زندگی کی گتھیاں تنہا عقل کی رُو سے نہیں سلجھ سکتیں..... اس لئے ہمیں تنہا عقل کو اپنا خدا نہیں بنا لینا چاہیئے۔ اس خدا کے عضلات (MUSCLES) تو بہت مضبوط ہیں لیکن اس کی ذات (personality) نہیں ہے۔ عقل اسباب و ذرائع پر تو خوب نگاہ رکھتی ہے لیکن مقاصد و اقدار کی طرف سے اندھی ہوتی ہے۔[1]

یعنی، انسانی عقل، فطرت کی قوتوں کو تو مسخر کر سکتی ہے لیکن انسانی معاملات کا اطمینان بخش حل دریافت نہیں کر سکتی۔ یہ اس کے دائرۂ منصب سے باہر کی چیز ہے۔ انسانی معاملات کے حل کے لئے ضروری ہے کہ یہ متعین کیا جائے کہ انسانی زندگی کا مقصد اور نصب العین کیا ہے۔ افراد اور اقوام کے مفاد میں تصادم کیوں ہوتا ہے اور اسے کس طرح روکا جا سکتا ہے۔ کونسی چیز عالمگیر انسانیت کے لئے منفعت بخش ہے اور کون سی مضرت رساں۔ نوعِ انسان میں مشترک اقدار کونسی ہیں اور ان کا باہمی تعلق کیا ہے۔ ان اقدار کی حفاظت کیوں ضروری ہے۔ انسان کے بنیادی حقوق کیا ہیں اور ان حقوق کا تحفظ کس طرح ممکن ہے۔ ان امور کا تعین 'عقل' اور اس کے مظاہر، علوم سائنس کے بس کی بات نہیں۔

> سائنس صرف یہ بتا سکتی ہے کہ "کیا ہے"۔ وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ "کیا ہونا چاہیئے"۔ اسلئے "اقدار کا تعین کرنا اسکے دائرے سے باہر ہے۔ سائنس کے علمبرداروں نے اکثر اوقات اس امر کی کوشش کی ہے کہ وہ سائنس کی رُو سے اقدار کے متعلق قطعی فیصلہ نافذ کریں۔ (لیکن یہ انکی غلطی ہے)..... سائنس کے نزدیک بس ایک شے ہوتی ہے۔ اسکی دنیا میں آرزو، اقدار، خیر و شر، نصب العین کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ سائنس اقدار متعین کر سکتی ہے اور نہ ہی انہیں انسانی سینے کے اندر داخل کر سکتی ہے۔[2]

۳۔ سوال یہ ہے کہ اگر انسانی معاملات کا حل انہی امور پر منحصر ہے اور ان کا تعین عقلِ انسانی کے بس کی بات نہیں، تو کیا، عقل کے علاوہ کوئی اور سرچشمۂ علم بھی ہے جس سے ان امور کا تعین ہو سکے اور کاروانِ انسانیت، راستے کے خطرات سے محفوظ و مصئون، اپنی منزلِ مقصود کی طرف قدم بڑھا سکے؟

---

[1] ALBERT EINSTEIN — OUT OF MY LATER DAYS

[2] EINSTEIN (IBID)

ہدایت خداوندی ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب عقل انسانی کی رُو سے نہیں مل سکتا۔ اس لئے کہ عقل اپنے علاوہ کسی اور سرچشمۂ علم کو جانتی ہی نہیں۔ اس کا جواب ہمیں ایک اور گوشے سے ملتا ہے، جو پورے حتم و یقین سے کہتا ہے کہ

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی ○ (۲۰/۵۰)

یعنی جس خدا نے کائنات کی ہر شے کو پیدا کیا ہے، اُسی نے یہ انتظام بھی کر رکھا ہے کہ ان اشیاء کو بتائے کہ ان کی منزلِ مقصود کونسی ہے اور وہ اس منزل تک کس طرح پہنچ سکتی ہیں۔ اس راہ نمائی کو وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے، جو خدا کی طرف سے براہ راست ملتی ہے۔

وحی کا سلسلہ اشیائے کائنات میں، وحی (یعنی خدا کی طرف سے براہ راست راہ نمائی ملنے) کا یہ سلسلہ از خود جاری و ساری ہے۔ ہر شے کی تخلیق کے ساتھ، اس کے اندر اس حقیقت کا علم رکھ دیا گیا ہے کہ اس کی نشوونما کے ذرائع کونسے ہیں اور اس نے انہیں کس طرح حاصل کرنا ہے۔ اس کے فرائض زندگی کیا ہیں، اور انہیں کس طرح سرانجام دیا جائے گا۔ خارجی کائنات میں، اس راہ نمائی (ہدایت) کو قوانین فطرت کہا جاتا ہے، اور حیوانات کی دنیا میں اسے جبلت (INSTINCT) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہر شے، ان قوانین (یا جبلت) کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور ان کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (۱۳/۱۵)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب قوانین خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ کسی کو ان سے یارائے سرکشی و عصیان نہیں۔ وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ (۱۶/۵۰)۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بحیر العقول کارگہ کائنات، اس نظم و نسق اور حسن و زیبائی سے سرگرم عمل ہے کہ اس میں کہیں انتشار و اختلال نہیں۔ کسی قسم کا فتور یا فساد نہیں مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ (۶۷/۳)۔

انسان کی راہ نمائی لیکن انسان کی کیفیت اس سے مختلف ہے۔ اس کی راہ نمائی (دیگر اشیائے کائنات کی طرح) پیدائش کے ساتھ، اس کے اندر ودیعت نہیں کی گئی۔ بکری کا بچہ پیدائشی طور پر جانتا ہے کہ اس کے لئے گھاس "حلال" ہے اور گوشت "حرام"۔ شیر کو از خود علم ہوتا ہے کہ اس کے لئے گوشت "جائز" ہے اور گھاس "ناجائز"۔ لیکن انسانی بچہ کو کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق بھی اتنا علم نہیں ہوتا کہ اس کے لئے کونسی شے نفع بخش ہے اور کونسی مضرت رساں۔ چہ جائیکہ اسے خیر و شر کی تمیز اور صحیح اور غلط اقدار کی تعیین کی استعداد از خود حاصل ہو۔

آدمی اندر جہانِ خیر و شر — کم شناسد نفع خود را از ضرر
کس نداند زشت و خوب کار چیست — جادۂ ہموار و ناہموار چیست

انسان کے اندر یہ راہ نمائی (وحی) اس لئے نہیں رکھی گئی کہ اگر ایسا کیا جاتا تو یہ بھی (دیگر

انسانی اختیار و ارادہ اشیائے کائنات کی طرح) اس راہ نمائی کے مطابق چلنے پر مجبور ہو جاتا — صاحب اختیار

وارادہ نہ رہتا — اس کا اختیار وارادہ وہ شرفِ عظیم ہے جس سے یہ دیگر اشیائے کائنات سے ممتاز و متمیز ہے۔ یہی اس کی سرفرازی و سربلندی کا باعث ہے اور اسی سے یہ مسجودِ ملائکہ اور مخدومِ خلائق ہے۔ اگر انسان کو قوتِ انتخاب حاصل نہ ہوتی تو یہ پتھر کا بت ہوتا یا زندانِ فطرت میں مجبوس و پابجولاں قیدی۔ اگر اس میں سرکشی و سرتابی کی استعداد نہ ہوتی تو اس کی اصول پرستی کبھی وجہِ شرف اور باعثِ تحسین و تبریک نہ ہوتی۔ اس لئے کہ نیکی وہی نیکی ہے جو بدی کی قدرت رکھتے ہوئے کی جائے۔ اطاعت وہی اطاعت ہے جو سرکشی کی استطاعت کے باوجود اختیار کی جائے۔ اُس سر کے جھکنے میں خوبی ہے جس کی پیشانی میں سرفرازیاں جھلک رہی ہوں۔ جس میں انتقام کی قوت نہیں' اس کے عفو میں کیا خوبی ہے۔ جس میں ہمسری کی ہمت نہیں' اس کا کسی کو جھک کر سلام کرنا خوئے غلامی ہے۔ اختیار رکھتے ہوئے' اپنے آپ پر کنٹرول رکھنا ہی وجہِ شرفِ انسانیت ہے۔ اسی سے اس کی ممکنات مشہود ہوتی ہیں اور زندگی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل بنتی ہے۔ اس کے اختیار وارادہ کا تقاضا تھا کہ خدا کی طرف سے راہ نمائی اس کے اندوختہ ودیعت کر کے نہ رکھی جاتی۔

تو کیا انسان کو اس راہ نمائی کے بغیر چھوڑ دیا گیا؟ نہیں۔ اسے بھی یہ راہ نمائی دی گئی لیکن اس کے لئے طریق دوسرا اختیار کیا گیا۔ یہ راہ نمائی 'مشیتِ خداوندی کے پروگرام کے مطابق' ایک فرد کی طرف وحی کی جاتی جو اسے دوسرے انسانوں تک پہنچاتا اور اسے اُن کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا کہ وہ اسے' علیٰ وجہ البصیرت' قبول کر لیں' یا اس سے انکار کر دیں۔ انہیں بتا دیا جاتا کہ اگر وہ اس کے مطابق زندگی بسر کریں گے تو ہر قسم کی شادابیاں اور سرفرازیاں ان سے ہمکنار ہوں گی۔ اگر اس کے خلاف چلیں گے تو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔

خدا کی یہ وحی' ان مقتدر ہستیوں کی وساطت سے جنہیں انبیاء کرامؑ کہا جاتا ہے' مختلف ادوار میں ملتی رہی' لیکن زمانہ کے حوادث اور انسانی تحریف کے ہاتھوں' وہ اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہ رہی۔ یہ وحی آخری اور مکمل شکل میں' اب سے قریباً چودہ سو سال پہلے' محمد رسول اللہ کی وساطت سے' انسانوں تک پہنچی۔ اس کے مجموعہ کا نام القرآن العظیم ہے۔

قرآن کریم

۵۔ قرآن کریم' خدا کی طرف سے بتدریج نازل ہوتا رہا اور قریب تیئیس سال کے عرصہ میں تکمیل تک پہنچا۔ نبی اکرمؐ نے اس کی کتابت اور حفاظت کا پورا پورا اہتمام و انتظام کیا۔ چنانچہ حضورؐ کی وفات کے وقت' یہ اپنی مکمل شکل میں' کتابی صورت میں بھی موجود تھا اور سینکڑوں حفاظ کے سینوں میں بھی محفوظ۔ یہی کتاب اپنی اصلی شکل اور ترتیب کے ساتھ' اس وقت ہمارے پاس موجود ہے اور تاریخی شہادات سے ثابت ہے کہ ان چودہ صدیوں میں' اس میں ایک حرف کا بھی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدائے جلیل نے لے رکھا ہے۔ یہ عظیم المرتبت کتاب' ابدی حقائق کا مجموعہ اور مستقل اقدار کا صحیفہ ہے۔ اس میں انسانی زندگی کے ہر گوشے کے لئے مکمل راہ نمائی موجود ہے۔

انسانی تصنیف' اپنے ماحول کی پیداوار' اور ایک خاص مقصد کی ترجمان ہوتی ہے' اس لئے اس کی زندگی ہنگامی اور وقتی' اور اس کی افادیت محدود ہوتی ہے۔ لیکن آسمانی کتاب کی کیفیت اس سے مختلف ہوتی ہے۔ وہ فضا اور ماحول کے اثرات سے بلند اور زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہوتی ہے۔ نہ اس کی تعلیم کبھی پرانی اور فرسودہ ہوتی ہے اور نہ ہی وہ کسی مقام پر انسان سے یہ کہتی ہے کہ میں اس سے آگے نہیں جا سکتی۔ وہ ہمیشہ زمانے کی امامت کرتی ہے اور انسانی زندگی کے ہر تقاضے کا اطمینان بخش حل بتاتی ہے۔ اس میں' افراد کی صلاحیتوں کی نشوونما ارتقاء کے اصول بھی ہوتے ہیں اور اقوام کے عروج و زوال سے متعلق قوانین بھی ——— قرآن کریم ان تمام خصوصیات کی حامل' آسمانی کتاب ہے' اور نوعِ انسان کے لئے آخری ضابطہ حیات ہونے کی وجہ سے' ہر حیثیت سے مکمل اور ہمہ گیر ہے۔

۶۔ ربِّ جلیل کی اس کتابِ عظیم نے بتایا کہ انسان کی ناکامیوں اور نامرادیوں۔ تباہیوں اور

انسانی ناکامیوں کی وجہ

بربادیوں۔ خوں ریزیوں اور فساد انگیزیوں کی بنیادی وجہ وہ تصورِ حیات ہے' جو اس نے غلط نگہی اور کج فہمی کی بنا پر انسانی زندگی کے متعلق قائم کر رکھا ہے۔ یہ نظریہ وہ ہے جسے عصرِ حاضر کی اصطلاح میں' مادی تصورِ زندگی (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی رُو سے سمجھا جاتا ہے کہ انسان' حیوانات ہی کی بڑھی ہوئی شکل ہے اور اس کی ہستی' اس کے مادی پیکر (جسم) سے وابستہ ہے' اور بس۔ اس کی زندگی' حیوانات کی طرح' طبیعی قوانین کے تابع سرگرمِ عمل رہتی ہے' اور انہی قوانین کے مطابق' ایک دن اس کے جسم کی مشینری بند ہو جاتی ہے۔ اس سے زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اس فرد کا کچھ باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا' انسان کے سامنے نہ حیوانی تقاضوں سے بلند کوئی تقاضا ہے' نہ طبیعی مقاصد کے علاوہ کوئی اور مقصد۔ عقل کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان تقاضوں کی تسکین کا سامان بہم پہنچائے اور اس کے لئے جو وسائل و ذرائع اختیار کرے' ان کے جواز کے دلائل تراشے۔ اس نظریہ کے مطابق زندگی بسر کرنے والوں کے سامنے "جنگل کے قانون" (یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس) سے بلند کوئی اور قانون ہو نہیں سکتا ——— اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے ——— اس سے مختلف افراد کے مفاد میں تصادم ہوتا ہے' اور جب یہی تصادم' افراد سے آگے بڑھ کر' اقوام تک پہنچتا ہے تو اس کی زلزلہ خیزیوں اور آتش فشانیوں سے انسانی دُنیا کا گوشہ گوشہ ویران ہو جاتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ انسان نے اپنی تمدنی زندگی کے لئے جس قدر راستے اختیار کئے' وہ اسے' سکون و اطمینان کی جنت کے بجائے' تباہی اور بربادی کے جہنم کی طرف لے گئے اور اس کے قصرِ حیات کی کوئی منزل بھی اپنی بنیادوں پر قائم نہ رہ سکی۔ اس لئے کہ

> انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا' خواہ اس باطل نظام کو کیسے ہی حسنِ تدبر اور دانش اطواری سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیاد

کمزوری' خارجی نظم و ضبط اور اِدھر اُدھر کی جُزئی مرمت سے' کبھی رفع نہیں ہو سکتی۔"

دُوسرا تصورِ حیات اس کے برعکس قرآنی تصورِ حیات یہ ہے کہ انسان صرف اس کے طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔ اسے' جسم کے علاوہ' ایک اور شے بھی عطا ہوئی ہے' جسے' انسانی ذات (Human personality) کہا جاتا ہے۔ انسانی ذات' نشوونما یافتہ شکل میں نہیں ملتی' بلکہ مضمر اور خوابیدہ صورت میں ملتی ہے۔ اس کی مضمر صلاحیتوں کو نشوونما دے کر' اس کی ممکنات کو مشہود کرتے جانا' انسانی زندگی کا مقصود ہے۔ اگر انسانی ذات کی مناسب نشوونما ہو جائے تو' اس سے انسانی زندگی' موت کے بعد' مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ اسے جنتی زندگی کہتے ہیں۔ جس طرح انسان کی جسمانی زندگی کی پرورش کیلئے قوانین مقرر ہیں' اسی طرح اس کی ذات کی نشوونما کے لئے بھی قوانین متعین ہیں۔ یہ قوانین' وحی کے ذریعے عطا کئے گئے ہیں اور قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔

۷۔ انسانی ذات کی نشوونما انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی بلکہ معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے ہو سکتی ہے۔

انسانی معاشرہ کی تشکیل اس لئے' انسانی ذات کی نشوونما کے لئے جو قوانین' قرآن کریم میں درج ہیں' ان سے انسانی معاشرہ کی تشکیل کے لئے بھی راہ نمائی ملتی ہے۔ جو معاشرہ ان قوانین کے مطابق متشکل ہوتا ہے' اس کے پیشِ نظر پوری کی پوری انسانیت کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس میں نہ افراد کے مفاد میں باہمی تصادم ہوتا ہے' نہ اقوام کے مقاصد میں تزاحم۔ اس لئے کہ انسانی ذات کی نشوونما کا بنیادی اُصول یہ ہے کہ جو شخص' جس قدر دوسروں کی نشوونما کرے گا' اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہوگی۔ ظاہر ہے کہ جس معاشرہ میں ہر فرد کی کوشش یہ ہو کہ وہ زیادہ سے زیادہ دوسروں کی منفعت کا کام کرے (تاکہ اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہو) اُس میں مفاد کے ٹکراؤ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ اور جب باہمی مفاد میں تصادم نہیں ہوگا تو وہ الجھنیں خود بخود ختم ہو جائیں گی جن کی وجہ سے انسانی تاریخ' یفسد فی الارض و یسفک الدماء (عالمگیر فساد انگیزیوں اور خونریزیوں) کا عبرت انگیز صحیفہ' اور اس کا ہر ورق انسانی چیرہ دستیوں اور ستم کوشیوں کا بھیانک مرقع بن رہا ہے۔ ان قوانین کو' جو خدا کی اس عظیم المرتبت کتاب میں منقوش ہیں' مستقل اقدار یا غیر متبدل اصولِ حیات کہا جاتا ہے۔ یہ اصول' انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہیں اور عالمگیر انسانیت کی ابدی راہ نمائی کے لئے کافی۔ ان میں نہ کسی تغیر و تبدل کی ضرورت ہے' نہ حک و اضافہ کی گنجائش۔ یہ ساحلِ حیات پر روشنی کے مینار کی طرح استادہ ہیں اور زندگی کی تلاطم خیزیوں اور زمانے کی طوفان انگیزیوں میں' انسانی کشتی کے ناخداؤں کی منزلِ مقصود کی طرف راہ نمائی کرتے ہیں۔ عقلِ انسانی کو ان روشنی کے میناروں کی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح انسانی آنکھ کو سورج کے نور کی احتیاج۔

۷۔ ROBERT BRIFFAULT — The MAKING OF HUMANITY.

جنتی معاشرہ

اِن مستقل اقدار اور غیر متبدل اصولوں کے مطابق، آج سے چودہ سو سال پہلے سرزمین حجاز میں نبی اکرمؐ اور حضورؐ کے رفقائے کارؓ کے مقدس ہاتھوں قرآنی معاشرہ کی تشکیل عمل میں آئی۔ اس معاشرہ نے جس قدر انسانیت ساز اور جنت بداماں نتائج مرتب کئے، انسانی تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔

> دُنیا کے اور بڑے بڑے انسانوں نے صرف اسلحہ، قانون اور سلطنتیں پیدا کیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ مادی قوتوں کی تخلیق کر سکے جو اکثر اوقات خود ان کی آنکھوں کے سامنے راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئیں۔ لیکن اِس انسان (محمدؐ) نے صرف جیوش و عساکر، مجالس قانون ساز، وسیع سلطنتوں، قوموں اور خاندانوں ہی کو حرکت نہیں دی بلکہ ان کروڑوں انسانوں (کے قلوب) کو بھی جو اس زمانے کی آباد دُنیا کے ایک تہائی حصہ میں بستے تھے.... اس نے ایک ایسی کتاب کی اساس پر، جس کا ایک ایک لفظ قانون کی حیثیت رکھتا ہے، ایک ایسی قومیت کی بنیاد رکھی جس نے دُنیا کی مختلف نسلوں اور زبانوں کے امتزاج سے ایک "اُمّتِ واحدہ" پیدا کر دی --- یہ لافانی اُمّت باطل کے خداؤں سے سرکشی اور تنفّر اور خدائے واحد کے لئے والہانہ جذب و عشق --- یہ ہیں دُنیا میں اِس عظیم ہستی کی یادگاریں۔ بہت بڑا مفکر۔ بلند پایہ خطیب۔ پیغامبر۔ مقنّن۔ سپہ سالار۔ معتقدات کا فاتح۔ صحیح نظریۂ حیات کو علیٰ وجہ البصیرت قائم کرنے کا ذمہ دار۔ اس نظام کا بانی جس میں باطل خدا، ذہنوں کی دنیا تک میں بار نہ پا سکیں۔ بیس دنیاوی سلطنتوں اور اس کے اوپر ایک آسمانی بادشاہت کا بانیؐ۔

دنیاوی سلطنتوں کے اوپر یہ "آسمانی بادشاہت" انہی مستقل اقدار اور غیر متبدل اصولوں کی فرمانروائی تھی جن کی حدود کے اندر رہتے ہوئے قرآنی معاشرہ، اپنا نظم و نسق سرانجام دیتا ہے، اور جس سے انسانیت کے ہر گوشے سے، حیاتِ نو کے چشمے اُبلتے اور اس کی کشتِ امید کو سیراب کرتے ہیں۔ جب تک یہ نظام قائم رہا، نوعِ انسان اس کی منفعت بخشیوں سے متمتع ہوتی رہی۔

اس کے بعد

اس کے بعد جب انسانوں نے اس کا دامن چھوڑ دیا، تو حیوانی سطحِ زندگی کے تقاضے پھر غالب آ گئے اور انسانی ذات کا تصور ان کے نیچے دب گیا۔ نتیجہ یہ کہ تباہیوں اور بربادیوں کے جس عذاب میں باقی اقوامِ عالم مبتلا تھیں، اسی میں یہ قوم بھی ماخوذ ہو گئی۔ اس لئے کہ قانونِ خداوندی کی نگاہ میں نہ کوئی قوم چہیتی ہے، نہ سوتیلی۔

---

† LAMARTINE — HISTORY DE LA TURQUIE (VOL. II)

جو قوم، قرآن کی مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرے گی، خوشگواریوں اور سرفرازیوں کی جنت سے بہرہ یاب ہوگی۔ جو ان کے خلاف جائے گی، نکبت و زبوں حالی کے جہنم میں جا گرے گی۔

۹۔ اس دورِ ہمایوں کے بعد، قرآنی نظام دنیا میں کہیں قائم نہیں ہوا لیکن خدا کا کائناتی قانون دنیا کو بتدریج، آہستہ آہستہ، قرآنی اقدار کے قریب لا رہا ہے۔ "آہستہ آہستہ" اسلئے کہ کائناتی قانون کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، اس کا ایک ایک دن ہمارے حساب و شمار سے، ہزار ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ دنیا کس طرح ان اقدار کے قریب آ رہی ہے، اس کا اندازہ دو چار مثالوں سے لگائیے۔

چند مثالیں

نزولِ قرآن سے پہلے، ذہنِ انسانی کا فیصلہ یہ تھا کہ ملوکیت، عین "انسانی فطرت" کے مطابق نظامِ جہاں بانی ہے۔ قرآن کریم نے اس تصور کی تردید کی اور کہا کہ انسانوں کو اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں۔ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسانوں سے اپنا حکم منوائے۔ قرآن نے یہ تصور دیا اور نبی اکرمؐ نے اس کے مطابق نظامِ مملکت قائم کر کے دکھا دیا۔ اس وقت عام انسانی ذہن کے لئے یہ تصور نامانوس تھا اس لئے اس نے اسے نہ اپنایا۔ لیکن آپ دیکھئے کہ وہی ذہن کس طرح اپنے سابقہ تصور کو چھوڑ کر قرآنی تصورِ مملکت کی طرف آ رہا ہے۔

انسانی ذہن کا اُس وقت فیصلہ یہ تھا کہ غلاموں کا وجود معاشرہ کا جزو لاینفک ہے اور فطرت کی صحیح تقسیم کا نتیجہ۔ قرآن نے یہ انقلابی تصور دیا کہ تمام افرادِ انسانیہ اپنی پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم ہیں، اس لئے کسی فرد کا دوسرے کو غلام بنا لینا، خلافِ انسانیت ہے۔ اُس وقت کے ذہن کی عام سطح نے اس تصور کو ناقابلِ قبول سمجھا لیکن اس کے بعد انسان نے خود اس تصور کے خلاف بغاوت کی اور غلامی کو انسانیت کے لئے لعنت قرار دیا۔

اُس وقت یہ تصور عام تھا کہ رنگ اور نسل کے اعتبار سے، ایک انسان کو دوسرے انسان پر فضیلت حاصل ہے۔ قرآن کریم نے کہا کہ یہ محض توہم پرستی ہے۔ انسان کی قدر و قیمت اس کے جوہرِ ذاتی کی ہے، نہ کہ انتسابات نسبی کی بنا پر۔ اس زمانے نے اس تصور کو اپنے لئے ناآشنا پایا، لیکن اب دیکھئے کہ دنیا سے یہ قدیم تصور کس طرح اُٹھتا جا رہا ہے، اور قرآنی تصور اس کی جگہ لے رہا ہے۔

اُس زمانے میں جاگیرداری۔ زمینداری۔ سرمایہ داری کا نظام عین مطابقِ فطرت سمجھا جاتا تھا۔ قرآن کریم نے یہ انقلاب انگیز تصور پیش کیا کہ رزق کے سرچشموں کا مقصد نوعِ انسانی کی نشو و نما ہے، اس لئے وسائلِ پیداوار تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں، اور معاوضہ محنت کا ہونا چاہئیے، نہ کہ سرمایہ کا۔ اُس زمانے کے انسانی ذہن نے اس عظیم انقلابی تصور کو ٹھکرا دیا۔ لیکن اب دنیا، رفتہ رفتہ، اپنے نظام کہن سے تنگ آ کر قرآنی نظام کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔

اُس زمانے میں' دنیا مختلف قبائل اور اقوام میں بٹی ہوئی تھی' اور عالمگیر انسانیت کا تصور کسی کے سامنے نہیں تھا۔ قرآن کریم نے بتایا کہ نوعِ انسان ایک ہمہ گیر برادری ہے اور اس کی عملی تشکیل کا طریق یہ ہے کہ ساری دنیا کا نظامِ حکومت ایک ہو' اور یہ نظام وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار کے مطابق قائم ہو۔ یہ بات اُس زمانے کے محدود ذہن میں سما نہ سکی' لیکن اب دیکھئے' دنیا کس طرح اقوام کی تفریق و تقسیم سے تنگ آکر' ایک عالمگیر نظام کی تلاش میں مضطرب و بیقرار ہے۔ اگرچہ اسے اس کی بنیاد نہیں ملتی — اس کی بنیاد صرف قرآنی اقدار سے مل سکے گی۔

"اس قسم کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں' لیکن ہم' بغرضِ اختصار' انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ زبانِ وحی نے صدیوں پہلے بتا دیا کہ نوعِ انسان کے لئے صحیح نظامِ زندگی کونسا ہے۔ جن لوگوں نے اس کی صداقت پر یقین کیا' انہوں نے اس نظام کو متشکل کر دیا' اور اسکے زندگی بخش' تعمیری نتائج نے وحی کے دعوے کو سچا ثابت کر دکھایا۔ دوسرے لوگوں نے اس سے انکار کیا اور اپنے لئے تنہا عقل کی راہ نمائی کو کافی سمجھا۔ عقل نے بھی بالآخر اسی سمت کو صحیح پایا جس کی نشاندہی وحی نے کی تھی' لیکن اُسے اس نتیجہ تک پہنچنے میں ڈیڑھ ہزار سال کا عرصہ لگ گیا' اور اس کے لئے انسان کو جن جانکاہ شقتوں اور جگر پاش مصیبتوں سے گزرنا پڑا' اس کی شہادت تاریخ کے رنگین اوراق دیتے ہیں۔

عقل کا تجرباتی طریق

عقل کا طریق تجرباتی ہے۔ یہ' کسی عقدہ کے حل کے لئے ایک تدبیر سوچتی ہے۔ اس پر عمل شروع ہوجاتا ہے۔ لیکن صدیوں کے تجربہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ تدبیر غلط تھی۔ اس پر عقلِ انسانی دوسری تدبیر سامنے لاتی ہے۔ پھر اس پر عمل شروع ہوجاتا ہے۔ یوں پیہم ناکام تجارب کے بعد' کہیں ہزاروں سال میں عقلِ انسانی صحیح نتیجہ تک پہنچتی ہے۔ لیکن انسان کو اس کی جس قدر قیمت ادا کرنی پڑتی ہے' اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اس کے برعکس' وحی' پہلے ہی دن' حقیقت کو بے نقاب کر کے سامنے لے آتی ہے اور اس طرح' ایک طرف انسان کا اس قدر قیمتی وقت بچا دیتی ہے اور دوسری طرف' اسے ان تمام ہلاکتوں اور تباہیوں سے محفوظ رکھتی ہے جو عقل کے تجرباتی طریق کا لازمی نتیجہ ہیں۔ گذشتہ ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ انسان' آخر الامر' اس نظامِ زندگی کو اختیار کرے گا جسے قرآن کریم نے پیش کیا تھا —— اس کے سوا اسے کوئی چارہ ہی نہیں —— لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ انسان نے' (الف لیلیٰ کی داستانی بوتل کا کارک کھول کر) تباہی اور بربادی کی جن مہیب عفریتی قوتوں کو فضا میں منتشر کرنا شروع کر دیا ہے' اور وہ جس تیزی سے انسانی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہیں' کیا اس سے اسے اتنی مہلت مل سکے گی کہ یہ عقل کے تجرباتی طریق سے' قرآنی نظامِ زندگی کی پناہگاہ تک صحیح و سلامت پہنچ جائے؟ واقعات اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔

نزولِ قرآن کے وقت' دنیائے تہذیب و تمدن کی حالت کیا ہوچکی تھی' اس کا نقشہ' ایک

مغربی مؤرخ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

نزول قرآن کے وقت دُنیا کا نقشہ

> اُس وقت ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قصر مشید جس کی تعمیر میں چار ہزار سال صرف ہوئے تھے' منہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا اور نوع انسانی پھر اسی بربریت کی طرف لوٹ جانے والی تھی جہاں ہر قبیلہ' دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا تھا اور آئین وضوابط کو کوئی جانتا تک نہ تھا۔ ....
>
> غرضیکہ وقت وہ آچکا تھا جبکہ ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا تھا۔ تہذیب کا وہ بلند وبالا درخت جس کی سرسبز وشاداب شاخیں کبھی ساری دُنیا پر سایہ فگن تھیں' اور آرٹ' سائنس اور لٹریچر کے سنہری پھلوں سے لدی ہوئی تھیں' اب لڑکھڑا رہا تھا۔ عقیدت واحترام کی زندگی بخش نمی اسکے تنے سے خشک ہو چکی تھی اور وہ اندر سے بوسیدہ اور کھوکھلا ہو چکا تھا۔ جنگ وجدال کے طوفان نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے جو صرف پرانی رسموں کے بندھن سے یکجا کھڑے تھے اور جن کے متعلق خطرہ تھا کہ اب گرے یا اب۔

اس کے بعد یہ مؤرخ یہ سوال سامنے لاتا ہے کہ'

> کیا ان حالات میں کوئی ایسا جذباتی کلچر پیدا کیا جاسکتا تھا جو نوع انسان کو ایک مرتبہ پھر ایک نقطہ پر جمع کر دے؟

اور خود ہی اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیتا ہے کہ

> یہ امر موجب حیرت واستعجاب ہے کہ اس قسم کا نیا کلچر عرب کی سرزمین سے پیدا ہوا۔ اور اُس وقت پیدا ہوا جبکہ اس کی اشد ضرورت تھی۔

آج دُنیا کی حالت اُس سے کہیں زیادہ نازک اور تشویش انگیز ہو چکی ہے جو زمانہ نزول قرآن کے وقت تھی۔

قرآن اب بھی سنبھال سکتا ہے

لیکن جس طرح قرآن کریم نے' انسانیت کو تباہی اور بربادی کے جہنم میں گرنے سے اُس وقت بچا لیا تھا' آج بھی اس میں اتنی قوت اور صلاحیت ہے کہ وہ گرتی ہوئی انسانیت کو سنبھال لے' اور راستے کی پُر خطر گھاٹیوں سے بچا کر' اسے صحیح وسلامت منزل مقصود تک پہنچا دے۔ اور دُنیا ایک بار پھر اس عظیم حقیقت کو بے نقاب دیکھ لے کہ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○ (۲/۳۸)۔ جو قوم قوانین خداوندی کا اتباع کرے گی' وہ خوف وحزن سے مامون رہے گی۔

---

* QUOTED BY IQBAL IN HIS LECTURES.

قرآن پریشاں خاطر و افسردہ حال، حیران و سرگرداں، راہ گم کردہ انسانیت کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (۳/۱۳۹)۔ تم تباہی و بربادی کی مہیب قوتوں سے مت خوف کھاؤ۔ تاریک مستقبل کی اندوہناکیوں اور ہلاکت سامانیوں سے مت گھبراؤ۔ جی نہ چھوڑو۔ حوصلہ نہ ہارو۔ مایوس نہ ہو۔ میں جو نظام پیش کرتا ہوں اس کی صداقت پر بھروسہ کرکے اسے عملاً آزماؤ۔ اور پھر دیکھو کہ تم شکست و ریخت کی ان تمام قوتوں پر غلبہ پاکر، کس طرح، خاک کی پستیوں سے آسمان کی بلندیوں تک جا پہنچتے ہو۔ یہ نظام اس کے سوا کیا ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرکے، ان کے حاصل کو وحی کی عطا کردہ اقدار کے مطابق، نوعِ انسان کی نشو و نما کے لئے صرف کیا جائے اور اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (۱۳/۱۷)

دنیا میں وہی نظامِ حیات باقی رہ سکتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کیلئے منفعت بخش ہو۔

اس کا عملی طریق اس کا عملی طریق یہ ہے کہ ایک خطۂ زمین کو اس نظام کی تجربہ گاہ بنا کر اس کے درخشندہ و تابناک، حیات بخش و انسانیت ساز نتائج کو دنیا کے سامنے لایا جائے اور یوں مضطرب و پریشان اقوامِ عالم کو بتایا جائے کہ ان کے لئے امن و سلامتی کا راستہ کونسا ہے۔ ان سے کہا جائے کہ

چارہ این است کہ از عشق کشادے طلبیم
پیشِ او سجدہ گذاریم و مرادے طلبیم

تم نے تنہا عقل کی راہ نمائی کو آزما کر دیکھ لیا۔ اب ذرا وحی کی شمعِ نورانی کو دلیلِ راہ بنا کر دیکھو!

لیکن یہ عملی طریق وہی قوم اختیار کر سکتی ہے جو ایک طرف قرآنی نظام کو اچھی طرح سمجھے اور دوسری طرف عصرِ حاضر کے تقاضوں پر اس کی نگاہ ہو۔ میں گذشتہ پچیس تیس سال سے قرآن کو اسی انداز سے قوم کے سامنے پیش کرتا چلا آرہا ہوں۔ مفہوم القرآن، جس کا تعارف آیندہ صفحات میں آپ کے سامنے آئے گا، اسی جہدِ پیہم اور سعیٔ مسلسل کی ایک اہم کڑی ہے جو میرے مدت العمر کے تدبر فی القرآن کا ماحصل ہے۔ مقصد اس سے اس عظیم حقیقت کا وانشگاف کرنا ہے کہ قرآن کریم، نوعِ انسانی کے لئے کس قسم کا نظامِ زندگی تجویز کرتا ہے اور وہ مستقل اقدار کونسی ہیں جن کی بنیادوں پر اس فلک بوس و کہکشاں گیر نظام کی حسین و جمیل عمارت استوار ہوتی ہے۔ اور وہ کس طرح، غلط نظام ہائے زندگی کے ہاتھوں تنگ آئے ہوئے انسان کے لئے گوشۂ عافیت اور مرکزِ حیات بنتی ہے۔ جب نوعِ انسانی کا یہ آخری ملجا و ماویٰ وجود میں آئے گا تو نوامیسِ فطرت اس کی طرف آنے والے انسانوں کا استقبال لَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ[1] ۝ (۴۱/۳۱) کی نشاط آور بشارتوں سے کریگے۔ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ[2] ۝ (۳۶/۵۸) کی نویدِ جاں فزا و نشیدِ دل نواز ان کے لئے فردوسِ گوش

---

[1] اس میں تمہارے لئے وہ سب کچھ ہے جسے تمہارا جی چاہے اور جس کی تم آرزو کرو۔ [2] خدائے رحیم کی طرف سے امن و سلامتی کی نویدِ جاں فزا۔

بنے گی۔ اور ندائے جمال 'جنت سے نکلے ہوئے آدم سے بجمال شفقت و محبت کہے گی کہ

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝ (۴۳/۷)

یہ ہے وہ جنت جس کے تم اپنے اعمال کی بدولت وارث بنائے گئے ہو۔

(اب تمہیں اس سے کوئی نہیں نکال سکے گا۔)

اور 'کامیاب و شادکام' انسان' ہزار مسکراہٹوں سے' آسمان کی طرف دیکھ کر کہے گا کہ

دیدمؔ آغازم ——— انجامم نگر۔

قرآن عظیم یہ کچھ کر کے دکھا سکتا ہے۔

گر زمینی! آسماں سازد ترا	آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا
خستہ باشی استوارت می کند	پختہ شل کوہسارت می کند
صیقلش آئینہ سازد سنگ را	از دلِ آہن رباید زنگ را
نوعِ انساں را پیامِ آخریں	حاملِ اُو رحمۃ للعالمین

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (۹/۱۷)

۲۵۔بی — گل برگ
لاہور

پرویز
جولائی ۱۹۶۱ء

۱؎ یقیناً یہ قرآن 'سفرِ زندگی میں' اُس راہ کی طرف راہ نمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی' ہموار اور محکم ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

چوں مسلماں اگر داری جگر — در ضمیر خویش و در قرآں نگر

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست

خدائے جلیل کی کتاب عظیم کا مختصر سا تعارف' سابقہ صفحات میں کرایا جا چکا ہے۔ وہیں یہ حقیقت بھی سامنے آچکی ہے کہ انسانی زندگی کے معاملات' تنہا عقل کی رُو سے حل نہیں ہو سکتے۔ ان کا حل اسی صورت میں مل سکتا ہے جب عقل' وحیٔ خداوندی کی روشنی میں کام کرے۔ یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں' قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے' اور تمام نوعِ انسان کے لئے' ہمیشہ کیلئے' ضابطۂ ہدایت ہے۔ یہ کتاب عظیم' ہر فرد اور ہر قوم کو' ہر زمانے میں' زندگی کے دوراہے پر بتاتی ہے کہ صحیح راستہ کونسا ہے اور غلط کونسا۔ انسانیت کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے' نہ اس کتاب کی راہ نمائی سے مفر ہو سکتا ہے' نہ ہی اس کا کوئی بدل ہے۔ سوال یہ ہے کہ حقائق و معارف کے اس بے بہا خزینہ اور رشد و ہدایت کے اس بے مثال گنجینہ سے' عصر حاضر میں کس طرح راہ نمائی حاصل کی جائے۔

قرآن فہمی کی اہمیت

۲- یوں تو دنیا کی ہر کتاب کی یہ کیفیت ہے کہ جب تک اُسے سمجھا نہ جائے اس سے مستفید نہیں ہوا جا سکتا' لیکن جس کتاب کی پوزیشن یہ ہو کہ انسان کو' زندگی کے ہر معاملہ میں' اُس سے راہ نمائی حاصل کرنی ہے' اُسے کماحقہٗ سمجھنے کی اہمیت کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔

یہ کتاب زندگی کے مسائل کے لئے عملی اُصول (فارمولے) دیتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ عملی اُصول (فارمولا) اُسی صورت میں صحیح نتیجہ پیدا کر سکتا ہے جب اس کے ہر جزو، مختلف اجزا کی ترتیب اور اس کے مجموعی طریقِ عمل کا صحیح صحیح علم ہو۔ اگر ان میں سے کسی ایک عنصر کے سمجھنے میں بھی غلطی ہو جائے تو وہ اُصول کبھی صحیح نتائج مرتب نہیں کرے گا اور انسان کی ساری محنت رائگاں جائیگی۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ قرآن کریم کی صداقت پر ایمان رکھتے اور اسے ضابطۂ حیات سمجھتے ہیں، اُن کے لئے اس کتاب کا صحیح طور پر سمجھنا کس قدر ضروری ہے۔ اُن کی تو زندگی، اور زندگی کی کامیابیوں کا دار و مدار ہی اس پر ہے۔

۳۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ایک عرصہ تک اس کتاب عظیم کی یہ حیثیت، اور اس کے سمجھنے کی اہمیت ہماری نگاہوں سے اوجھل رہی (اور اس کا خمیازہ بھی ہم نے بھگتا۔ اور ابھی تک بھگت رہے ہیں)۔ اسے ایک "مقدس صحیفہ" سمجھا جاتا رہا، جس کا مطلب یہ تھا کہ اسے ریشمی غلافوں میں لپیٹ کر، اونچے طاق پر رکھا جائے، تاکہ اُس کی جانب پُشت ہو جانے سے اس کی بے ادبی نہ ہو۔ یا، اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لئے، اس کی قسم کھائی جائے۔ اور اگر اسے پڑھا جائے تو محض بغرضِ ثواب — خواہ وہ ثواب اپنے لئے ہو یا مُردوں کو بخشنے کے لئے۔ لیکن مقامِ مسرت ہے کہ اب رفتہ رفتہ، اس بلند و بالا کتاب کا صحیح مقام سامنے آ رہا ہے، اور اسے سمجھ کر پڑھنے کی اہمیت نمایاں ہو رہی ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا رجحان اس کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس کے حقائق کو بے نقاب دیکھنے کی تڑپ ان کے دل میں پیدا ہو رہی ہے۔ لیکن اسے شکایت ہے کہ مروجہ ترجموں سے قرآن کریم سمجھ میں نہیں آتا، اور تفاسیر کا

نوجوان طبقہ کی مُشکلات

یہ عالم ہے کہ کثرتِ تعبیر سے، خواب پریشان سے پریشان تر ہو جاتا ہے۔ اس سے نوجوان گھبرا اُٹھتا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے۔ اس کے شوق کا یہ عالم ہے کہ وہ بار بار قرآن کریم کی تلاوت شروع کرتا ہے، لیکن اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ ذوق اور عقیدت کی بنا پر، پہلے پارہ کے رُبع یا نصف تک بمشکل پہنچتا ہے، اور اس کے بعد اسے مجبوراً بند کر دیتا ہے۔

۴۔ میں قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالبِ علم ہوں جس نے اپنی عمر اس کے سمجھنے اور سمجھانے میں صرف کی ہے۔ قرآنی فکر کو دوسروں تک پہنچانے کے سلسلہ میں میرا اوّلین مخاطب طبقہ، قوم کا یہی نوجوان، تعلیم یافتہ گروہ رہا ہے (اور اب تک ہے)۔ میں نے نوجوانوں کی نفسیات کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کے دل کی گہرائیوں میں اُتر کر ان کے جذبات و احساسات، اور رجحانات و میلانات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے ذہن میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات پر بنظرِ تعمق غور کیا ہے تو اُن اسباب و علل کی تحقیق کی ہے جن کی وجہ سے یہ اکثر "مذہب" سے برگشتہ ہو جاتے ہیں۔ میں ہزارہا نوجوانوں سے ملا ہوں جن کے سینے میں، عدم یقین اور تذبذب کی آتش ناموش

سلگ رہی تھی لیکن ہنوز بھڑکی نہیں تھی۔ اور ان ژولیدہ مو' آشفتہ مغز' بیباک سرپھروں سے بھی جن کی یہ آگ 'شعلہ بن کر اٹھی' اور جوالامکھی کی طرح پھٹ پڑی تھی' اور جنہیں مذہب' اور اس کی طرف منسوب کردہ ہر شے سے بیزاری ہی نہیں بلکہ چڑ سی ہو گئی تھی۔ میں نے' نہ کبھی اول الذکر گروہ کے تذبذب اور تحلل یقینی کو "لاحول" پڑھ کر ٹھکرایا' اور نہ ہی ثانی الذکر کے سرکش جذبات کو مایوسی کی شکنوں سے دھتکارا۔ میں نے ان کے لئے' ہمیشہ' اپنے سینے کو کھلا رکھا اور انہیں سمجھنے اور قریب لانے کی کوشش کی اس کے لئے میں نے' قرآن کریم کے ابدی حقائق کو' اپنے دور کی علمی سطح کے مطابق' عقل و بصیرت کی روشنی میں ان کے سامنے پیش کیا' اور ان کے شکوک و شبہات کی خلشوں کو' دلائل و براہین سے دور کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ بالعموم یہ نکلا' کہ جو مذہب کو گالیاں دیتے ہوئے آتے وہ دینِ خداوندی کے گرویدہ بن کر جاتے ہیں' اس طرح' آہستہ آہستہ' اس طبقہ کو قرآن کریم تک لے آتا' اور اس کے بعد ان سے کہتا کہ وہ اسے خود سمجھنے کی کوشش کریں ——— وہ اس کے لئے کوشش کرتے' اور نہایت نیک نیتی سے ایسا کرتے' لیکن (جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں)' بار تھک کر پکارا اٹھتے' کہ مروجہ ترجموں سے قرآن کریم ان کی سمجھ میں نہیں آتا!

میں نے جب ان کی مشکلات پر غور کیا تو ان کی شکایت کو درست پایا۔ وہ ایسا کہنے میں حق بجانب تھے کہ قرآن کریم مروجہ تراجم سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ان میں سے جنہوں نے' تراجم سے آگے بڑھ کر' کسی تفسیر کو دیکھا تھا' ان کا کہنا یہ تھا کہ اس سے' قرآن کریم کا سمجھ میں آنا تو ایک طرف' انسان کے ذہن میں مزید الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔

یہ اجمال تھوڑی سی تفصیل چاہتا ہے۔

روایات کی رُو سے تفسیر

۵۔ کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن کریم نبی اکرمؐ پر نازل ہوا اور حضورؐ نے اسے صحابہؓ کی جماعت کو سمجھایا۔ ظاہر ہے کہ اس آسمان کے نیچے اس ذات اقدس و اعظمؐ سے بہتر نہ تو کوئی قرآن کو سمجھانے والا ہو سکتا ہے' اور نہ قدوسیوںؓ کی اس جماعت سے بہتر' سمجھنے والا ——— اس لئے ہمیں قرآن فہمی کے سلسلہ میں کسی اور طرف رُخ کرنے کی ضرورت ہی نہیں: یہ بالکل بجا اور درست ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جو کچھ حضورؐ نے سمجھایا تھا وہ اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں ہم تک نہیں پہنچا۔ اس کا واضح اور بیّن ثبوت یہ ہے کہ قرآن کریم کی جس تفسیر کو نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے' وہ زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ وہ حضورؐ کی حقیقی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ مثلاً' صحیح بخاری کو احادیث نبویؐ کا مستند ترین مجموعہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں ایک حصہ کتاب التفسیر کا ہے۔ یعنی اس میں قرآنی آیات کی وہ تفسیر درج کی گئی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ نبی اکرمؐ نے بیان فرمائی تھی۔ یہ تفسیر کس قسم کی ہے' اس کے لئے آپ سورۂ بقرہ کی اس آیت کو لیجئے جو اس میں سب سے پہلے درج ہے۔ یعنی' وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَآءَ

کُلَّهَا (۲/۳۱)۔ "آدم کو خدا نے تمام چیزوں کے نام بتا دیئے" اِس کی تفسیر میں لکھا ہے۔

حضرت انس بن مالکؓ رسول خداؐ سے روایت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن سب مسلمان جمع ہو کر مشورہ کریں گے کہ آج ہم کسی کو اپنا شفیع بنائیں۔ اور آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور کہیں گے کہ آپ سب کے باپ ہیں۔ آپ کو اللہ نے ملائکہ سے سجدہ کرایا ہے اور آپ کو تمام نام سکھائے ہیں۔ آپ ہماری شفاعت کریں تاکہ ہم آج اس جگہ کی تکلیف سے راحت پائیں۔ وہ کہیں گے کہ آج میں اِس قابل نہیں۔ اور اپنا گناہ یاد کریں گے (خلاف حکم درخت کا پھل کھا لیا تھا) اور اللہ سے شرمائیں گے۔ اور کہیں گے کہ تم نوحؑ کے پاس جاؤ۔ ان کو اللہ نے سب سے پہلا نبی بنا کر زمین پر بھیجا تھا۔ سب آدمی ان کے پاس آئیں گے۔ وہ کہیں گے کہ آج میں اس قابل نہیں اور اپنا گناہ یاد کر کے شرمائیں گے۔ اور کہیں گے کہ تم ابراہیمؑ خلیل اللہ کے پاس جاؤ۔ سب ان کے پاس آئیں گے۔ یہ بھی ایسا ہی کہیں گے اور کہیں گے کہ تم موسٰیؑ کے پاس جاؤ۔ اللہ نے ان سے باتیں کی ہیں اور توریت عطا فرمائی ہے۔ وہ ان کے پاس آئیں گے۔ وہ بھی کہیں گے کہ میں آج کے دن تمہارا شفیع نہیں ہو سکتا' اور اپنا گناہ یاد کر کے اللہ سے شرمائیں گے اور کہیں گے کہ تم عیسٰیؑ کے پاس جاؤ۔ وہ رسول اللہ اور کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں۔ جب ان کے پاس آئیں گے یہ بھی ایسا ہی کہدیں گے اور کہیں گے کہ تم محمدؐ کے پاس جاؤ جن کے اللہ نے اگلے پچھلے سارے گناہ بخش دیئے ہیں۔ وہ اس وقت میرے پاس آئیں گے۔ میں ان کو اللہ کے پاس بخشوانے لے جاؤں گا اور اللہ کے حضور (داخلہ کی) اجازت طلب کروں گا تو مجھ کو (آنے کی) اجازت ملے گی۔ تو جس وقت میں اپنے رب کو دیکھوں گا تو سجدے میں گر پڑوں گا اور اللہ جو بات میرے دل میں ڈالے گا وہ کہوں گا۔ پھر اللہ کی طرف سے کہا جائے گا (اے محمدؐ) سر کو اٹھا اور سوال کر تاکہ عطا کیا جائے۔ اور کہہ تیرا کہنا سنا جائے گا اور تیری شفاعت قبول کر لی جائے گی۔ اِس وقت میں سر اٹھاؤں گا۔ اور جیسے اللہ نے مجھے تعلیم دی تھی ویسے ہی اس کی تعریف بجا لاؤں گا۔ پھر شفاعت کروں گا۔ اس وقت ایک گروہ بخشا جائے گا (یعنی مہاجرین و انصار اور بڑے بڑے نیک بندے۔ اولیاء، شہداء) اور ان کو جنت میں بھجوا دوں گا۔ پھر اللہ کی طرف آؤں گا اور دیکھ کر سجدے میں جاؤں گا اور شفاعت کروں گا اس مرتبہ بھی ایک گروہ بخشا جائے گا۔ اسی طرح تیسری دفعہ۔ پھر چوتھی دفعہ ایسے ہی شفاعت کروں گا۔ پھر اللہ سے کہوں گا کہ کوئی باقی نہیں رہا سوائے ان کے جن کو قرآن نے روکا ہے اور ان پر ہمیشہ کے لئے دوزخ میں رہنے کا حکم ہے۔ ابو عبداللہ بخاری کہتے ہیں' جن کے بارے میں

یہ آیت (خَالِدِیْنَ فِیْھَا) ہے۔

(ترجمہ مرزا حیرت دہلوی۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۹۴)۔

ظاہر ہے کہ یہ روایت "وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا" کی تشریح نہیں کرتی۔ اور اس کا مضمون بتا رہا ہے کہ یہ نبی اکرمؐ کی بیان فرمودہ تفسیر کا صحیح ریکارڈ نہیں ہو سکتی۔

ایک اور آیت لیجئے۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمْ۔ (۵/۸۷)۔ "اے ایمان والو! جس کو اللہ نے تمہارے لئے حلال اور پاک کر دیا ہے اس کو تم حرام مت بناؤ"۔ اس کی تفسیر میں صحیح بخاری میں حسب ذیل روایت مذکور ہے۔

> عبداللہ ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ ہم رسولؐ خدا کے ہمراہ جہاد میں شریک تھے اور ہمارے ساتھ عورتیں نہ تھیں (اور عورتوں سے جدائی کی برداشت نہ ہوتی تھی بوجہ حرارت اور قوت کے) تو ہم نے عرض کیا۔ آیا ہم خصی ہو جائیں۔ آپ نے منع فرمایا، اور پھر اجازت دیدی کہ عورت سے تھوڑے یا زیادہ دن مقرر کر کے، جس میں وہ عورت راضی ہو نکاح کر لو (تاکہ اس فعل یعنی خصی ہونے سے بچو اور نگاہ بد کسی پر نہ پڑے)۔ پھر یہ آیت پڑھی (ایضاً صفحہ ۴۹۰)

آیت کا مطلب صاف تھا، لیکن اس تفسیر نے ذہن میں جو اُلجھاؤ پیدا کر دیا وہ ظاہر ہے۔ (اس سے چند دنوں کے لئے عارضی نکاح کا جواز ثابت ہوتا ہے)۔ لہٰذا یہ تفسیر نبی اکرمؐ کی نہیں ہو سکتی۔

میں ان دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ اگر آپ تفصیل میں جانا چاہتے ہوں تو صحیح بخاری (یا صحاح ستہ میں سے کسی اور کتاب) میں تفسیری روایات ملاحظہ فرمالیں۔ بات واضح ہو جائے گی کہ ان روایات کی رُو سے، جنہیں نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور جن کا مضمون بتاتا ہے کہ وہ نبی اکرمؐ کے ارشادات گرامی نہیں ہو سکتے، قرآن کریم سمجھ میں نہیں آسکتا۔

تفسیر ابن کثیر

۶۔ کتب احادیث کے بعد، ہمارے سامنے کتب تفاسیر آتی ہیں۔ ان میں اس تفسیر کو معتبر ترین سمجھا جاتا ہے جس کی تائید میں کوئی حدیث یا صحابہؓ میں سے کسی کا قول درج ہو۔ ان تفاسیر میں تفسیر ابن کثیر بڑی قابل اعتماد سمجھی جاتی ہے۔ اس میں آیت (وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا) کی تفسیر میں لکھا ہے۔

> فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو تمام نام بتائے۔ یعنی ان کی تمام اولاد کے، سب جانوروں کے، زمین، آسمان، پہاڑ، تری، خشکی، گھوڑے، گدھے، برتن، بھانڈے، چرند پرند، فرشتے، تارے وغیرہ تمام چھوٹی بڑی چیزوں کے نام...... صحیح قول یہی ہے کہ تمام چیزوں کے نام سکھائے تھے۔ ذاتی نام بھی اور صفاتی نام بھی۔ اور کاموں کے نام بھی۔ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ گوز کا نام بھی بتایا گیا تھا۔ (ترجمہ مولانا محمد جوناگڑھی۔ پارہ اول، صفحہ)

(اس کے بعد صحیح بخاری کی وہ روایت مذکور ہے جسے اوپر درج کیا جا چکا ہے۔)۔

ترجمہ شاہ عبدالقادرؒ

- کتب احادیث و تفاسیر کے بعد تراجم کی طرف آئیے۔ اردو کے موجودہ تراجم میں شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ مستند ترین سمجھا جاتا ہے۔ اس ترجمہ کا انداز اس قسم کا ہے۔

> مثلهم كمثل الذي استوقد نارا فلما اضاءت ما حوله ذهب
> الله بنورهم وتركهم في ظلمت لا يبصرون ○ صم بكم عمي
> فهم لا يرجعون ○ او كصيب من السماء فيه ظلمت ورعد و
> برق يجعلون اصابعهم في اذانهم من الصواعق حذر الموت
> والله محيط بالكفرين ○ ([illegible])

> مثال ان کی جیسے مثال اس شخص کی جلادے آگ۔ پس جب روشن کیا
> جو کچھ گرد اس کے تھا لے گیا اللہ روشنی ان کی اور چھوڑ دیا ان کو بیچ اندھیروں
> کے نہیں دیکھتے۔ بہرے ہیں، گونگے ہیں۔ اندھے ہیں۔ پس وہ نہیں پھر آتے۔
> یا مانند مینہ کے آسمان سے بیچ اس کے اندھیرے ہیں اور گرج ہے اور بجلی۔
> کرتے ہیں انگلیاں اپنی بیچ کانوں اپنے کے، کڑک سے ڈر موت کے سے۔ اور
> اللہ گھیرنے والا ہے کافروں کو۔

اس ترجمہ پر تنقید مقصود نہیں، لیکن یہ تو واضح ہے کہ جب ایک تعلیم یافتہ نوجوان اس کی شکایت کرے کہ اس ترجمہ سے قرآن کا مفہوم اس کی سمجھ میں نہیں آتا تو اس کی یہ بات ایسی نہیں جس پر اُسے جھڑک دیا جائے۔ اس پر توجہ دینا ضروری ہے۔

ترجمہ مفہوم کو واضح کر ہی نہیں سکتا

- حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ، خواہ وہ دُنیا کی کسی زبان میں بھی کیوں نہ ہو، قرآنی مفہوم کو واضح کر ہی نہیں سکتا ——— حتیٰ کہ اگر قرآن کریم کے الفاظ کی جگہ، خود عربی زبان کے دوسرے الفاظ رکھ دیئے جائیں، تو بھی بات کچھ سے کچھ ہو جائے گی۔ قرآن کریم کا انداز اور اسلوب بالکل نرالا ہے۔ یہ اپنی مثال آپ ہے۔ الفاظ تو اس کے عربی زبان ہی کے ہیں، لیکن ان میں جامعیت اس قدر ہے کہ نہ ان الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ لے سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی ترتیب میں رد و بدل کرنے سے، وہ بات باقی رہ سکتی ہے۔ اس لئے، قرآن کریم کے ترجمہ میں اس کا پورا پورا مفہوم آ نہیں سکتا۔ اس بات

امام ابن قتیبہ کی رائے

میں، امام ابن قتیبہؒ (متوفی [illegible]) کتاب القرطین میں عربوں کے مختلف اسالیب بیان کی خصوصیات کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

قرآن کریم کا نزول' ان تمام اسالیب کلام کے مطابق ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ترجمہ کرنے والا' قرآن کریم کا ترجمہ کسی زبان میں (کماحقہ) نہیں کرسکتا' جیسا کہ ترجمہ کرنے والوں نے' انجیل کا ترجمہ سریانی زبان سے' حبشی یا رومی زبان میں کرلیا تھا' ایسے ہی زبور اور تورات کے تراجم اور باقی کتب الٰہیہ کے تراجم عربی زبان میں کرلئے گئے تھے۔ کیونکہ عجمی زبانوں میں مجاز کی وہ وسعت نہیں جو عربی زبان میں ہے[1]۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ اگر آپ قرآن کریم کی اس آیت کا ترجمہ کرنا چاہیں —

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ (۸/۵۸)

تو آپ قیامت تک ایسے الفاظ مہیا نہیں کرسکتے جو ان معنوں کو ادا کردیں جو اس آیت میں ودیعت ہیں' بجز اس کے کہ آپ اس نظم و ترتیب کو توڑ کر الگ الگ چیزوں کو ملائیں اور جو چیزیں اس میں ودیعت کی گئی تھیں' انہیں اس طرح ظاہر کردیں' اور یوں کہیں کہ "اگر تمہارے درمیان اور کسی قوم کے درمیان صلح اور معاہدہ ہو' اور تمہیں ان سے خیانت اور نقض عہد کا اندیشہ ہو' تو پہلے انہیں بتا دو کہ جو شرائط تم نے ان کے لئے منظور کی تھیں' تم نے انہیں توڑ دیا ہے' اور اس کے ساتھ ہی ان کے خلاف اعلان جنگ بھی کردو تاکہ تم اور وہ دونوں نقض عہد کو جان لینے میں برابر سرابر ہو جاؤ"۔

ایسے ہی قرآن کریم کی ایک دوسری آیت ہے۔

فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا (۱۸/۱۱)

اگر آپ چاہیں کہ اس مضمون کو کسی دوسری زبان کے الفاظ میں منتقل کردیں تو اس سے وہ مضمون قطعاً نہیں سمجھا جاسکے گا جو ان الفاظ سے سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر آپ یہ کہیں کہ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ "ہم نے انہیں چند سال تک سُلائے رکھا" تو اب بھی آپ نے مضمون کا ترجمہ تو کردیا' مگر الفاظ کا ترجمہ نہیں کرسکے۔

ایسے ہی قرآن کریم کی تیسری آیت ہے

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (۲۵/۷۳)

---

[1] اس میں شبہ نہیں کہ عجمی زبانوں میں' عربی زبان کی سی وسعت نہیں' لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ عربی زبان کے علاوہ' اس میں قرآن کریم کے خاص اسلوب کو بنیادی دخل ہے۔ اور یہ خصوصیت ہر آسمانی کتاب کی ہوتی ہے۔ وحی کا انداز ہی نرالا ہوتا ہے خواہ اس کی زبان کوئی بھی ہو۔ آج ہمارے سامنے' قرآن کریم کے علاوہ' کوئی اور آسمانی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں' ورنہ ہم دیکھتے کہ وحی کی زبان کا ترجمہ (کماحقہ) ہو نہیں سکتا' خواہ وہ کوئی آسمانی کتاب ہو۔ انجیل اور تورات کے جو تراجم ہمارے سامنے ہیں' اوّل تو وہ اصل کتابوں کے براہ راست تراجم نہیں۔ اور اگر (بفرض محال) یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ وہ اصل کتابوں کے تراجم ہیں' تو کون کہہ سکتا ہے کہ اصل کیا تھا اور وہ ترجمہ میں آکر کیا ہو گیا؟

اگر آپ اس آیت کا ترجمہ، اس کے الفاظ کے مطابق کریں گے تو وہ ایک مغلق بات بن جائیگی۔ اور اگر آپ یوں کہیں گے کہ "وہ لوگ اس سے تغافل نہیں برتتے" تو اس سے آپ نے مضمون کو دوسرے الفاظ میں ادا کر دیا ہے۔ ترجمہ نہیں کیا۔ (قرطبین جلد دوم۔ صفحہ ۱۲۳)۔

ایک مستشرق کی رائے

یہ تو اپنوں کی رائے ہے۔ غیروں میں سے بھی جس نے قرآن کریم کا مطالعہ بنظرِ غائر کیا ہے، وہ اسی نتیجہ پر پہنچا ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ (کما حقہٗ) کسی زبان میں نہیں ہو سکتا۔ مشہور مستشرق گب (H.A.R. GIBB)، اپنی کتاب (Modern Trends in Islam —1945 ed.) میں لکھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا ——— جس طرح کسی بلند شاعری کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ وحی کی زبان ہی مختلف ہوتی ہے ...... قرآن کریم کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرو تو اس سے زیادہ کیا ہو گا کہ اس کے عربی زبان کے 'تراشے ہوئے نگینوں کے گوشوں کو جامع طور پر سامنے لانے کے بجائے' مترجم اپنے وضع کردہ ایسے الفاظ استعمال کریگا جو اصلی الفاظ کی وسعت اور جامعیت کو مقید کر دیں گے۔ ایسی آیات میں، جن میں عام واقعات یا قوانین و احکام مذکور ہوں، ترجمہ کا یہ نقص شاید زیادہ نقصان رساں نہ ہو، لیکن، بایں ہمہ، جو مد و جزر، جو نشیب و فراز، جو بلندیاں اور گہرائیاں، جو لطافتیں اور باریکیاں، اور اس کے ساتھ جو جوش و خروش، اصل کتاب میں جلوہ فرما ہے، وہ ترجمہ میں کیا آسکے گا! ذرا اس صاف اور سیدھی سی آیت کو لیجئے۔

إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَإِلَيْنَا الْمَصِيرُ ۝ ([illegible])

اور انگریزی ہی نہیں، دنیا کی کسی زبان میں اس کا ترجمہ کر کے دکھایئے۔ اس کے چھ الفاظ میں، جو پانچ مرتبہ "ہم" (WE) کی تکرار ہے، اسے کونسی زبان ادا کر سکے گی؟

(صفحہ ۴ ترجمہ رواں)

اس مشکل کا حل

۹۔ میں قرآن کریم کے ترجمہ کی ان مشکلات پر ایک مدت تک غور کرتا رہا، اور اس کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ کرنے کا کام یہ ہے کہ

(ا) عربی زبان کی مستند کتب لغت و تفاسیر کی مدد سے، قرآن کریم کے تمام الفاظ کے معانی، پوری وسعت اور جامعیت کے ساتھ متعین کئے جائیں، اور اس کے لئے جہاں تک پیچھے جا سکتے ہوں، جائیں، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ نزولِ قرآن یا اس سے قریب تر زمانہ میں ان الفاظ سے بالعموم کیا مفہوم لیا جاتا تھا۔

(ii) پھر یہ دیکھا جائے کہ قرآن کریم نے ان الفاظ کو کن کن معانی میں استعمال کیا ہے۔ اس کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک بات کو مختلف مقامات پر بیان کرتا ہے' اور ان تمام مقامات کو بیک وقت سامنے لانے سے ان الفاظ کا مفہوم نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔ یہ کام میرے لئے آسان تھا' اس لئے کہ میں اس سے پہلے سالہا سال کی محنت سے قرآن کریم کی تبویب (CLASSIFICATION) کا کام مکمل کر چکا تھا۔

(iii) علاوہ ازیں جن الفاظ کو قرآن کریم نے بطور اصطلاحات استعمال کیا ہے' ان کا مفہوم بھی قرآن کریم سے متعین کیا جائے اور دیکھا جائے کہ وہ ان جامع اصطلاحات سے' اپنی تعلیم کے کس قسم کے تصورات (Concepts) پیش کرتا ہے۔ یہ نکتہ بڑا اہم ہے۔ اسے ذرا آگے چل کر تفصیلاً بیان کیا جائیگا۔

لغات القرآن اس پروگرام کے مطابق میں نے قرآنی مفردات کے معانی متعین کرنے کے لئے تحقیق شروع کی' اور مدت دراز کی مسلسل محنت کے بعد' ایک ایسا جامع لغت مرتب کیا جس میں ہر لفظ کا مفہوم' نہایت وضاحت سے سامنے آجاتا ہے۔ بعض مقامات پر ایک لفظ کے مفہوم کی وضاحت کے لئے' دس دس' بارہ بارہ' صفحات درکار ہوئے ہیں۔ یہ لغت قریب ساڑھے اٹھارہ سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

مفہوم القرآن اس کے بعد اگلا مرحلہ سامنے آیا۔ یعنی قرآنی الفاظ کے جو معانی اس طرح متعین کئے گئے ہیں' ان کی رو سے' آیات قرآنی کا مفہوم متعین کیا جائے اور اس طرح' (الحمد سے والناس تک) پورے قرآن کریم کا (مسلسل) مفہوم سامنے آجائے۔ کافی غور و خوض کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کے لئے وہی انداز اختیار کیا جائے جس کی طرف امام ابن قتیبہؒ نے اشارہ کیا ہے۔ یعنی قرآنی آیات کا ترجمہ نہ کیا جائے (کیونکہ ترجمہ سے بات واضح نہیں ہو سکتی)۔ بلکہ ان کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کیا جائے خواہ یہ کتنی ہی جگہ کیوں نہ گھیر لے۔ چنانچہ میں نے اس کام کو بھی ہاتھ میں لے لیا' اور اپنی استعداد اور بصیرت کے مطابق' جو کچھ کر سکا' وہ ''مفہوم القرآن'' کی شکل میں احباب کے سامنے ہے۔

قرآنی اصطلاحات

۹۔ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے' قرآن فہمی کے سلسلہ میں' سب سے اہم سوال' قرآنی اصطلاحات کے صحیح مفہوم کی تعیین ہے۔ کوئی فن یا موضوع ہو' اس میں اصطلاحات کی حیثیت بنیادی اور کلیدی ہوتی ہے' اور جب تک ان اصطلاحات کا صحیح تصور سامنے نہ آئے' متعلقہ موضوع یا فن سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اصطلاحات کے الفاظ تو اسی زبان کے ہوتے ہیں جس میں باقی کتاب لکھی گئی ہو لیکن ان کا مفہوم بڑا جامع اور مخصوص ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو الفاظ اصطلاحات کے لئے استعمال کئے جائیں اُن کے معانی کا اصطلاحات کے معانی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا' ایسا نہیں ہے۔ اصطلاحات کے معانی کی بنیاد' ان الفاظ کے معانی ہی پر رکھی جاتی ہے' البتہ ان کے مفہوم میں وسعت

پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے بھی اپنی اصطلاحات اسی طرح وضع کی ہیں، اور ان کے معانی کی خود ہی وضاحت کر دی ہے۔ ان معانی کے سمجھنے کا طریق یہ ہے کہ پہلے ان الفاظ کے بنیادی معانی کو سمجھا جائے جن سے وہ اصطلاحات وضع کی گئی ہیں۔ اس کے بعد قرآن کریم کے ان تمام مقامات کو سامنے لایا جائے جن میں وہ اصطلاحات آئی ہیں۔ ایسا کرنے سے ان کے معانی واضح طور پر سامنے آجائیں گے۔ میں نے لغات القرآن میں ان اصطلاحات کے معانی اسی طرح متعین اور بیان کئے ہیں، اور وہی معانی اب مفہوم القرآن میں پیش کئے گئے ہیں۔ مثلاً

صلوٰۃ قرآن کریم کی ایک خاص اصطلاح "اقامتِ صلوٰۃ" ہے جس کے عام معنی نماز قائم کرنا یا نماز پڑھنا کئے جاتے ہیں۔ لفظ صلوٰۃ کا مادہ (ص۔ ل۔ و) ہے، جس کے بنیادی معنی کسی کے پیچھے پیچھے چلنے کے ہیں۔ اس لئے صلوٰۃ میں قوانینِ خداوندی کے اتباع کا مفہوم شامل ہوگا۔ بنابریں اقامتِ صلوٰۃ سے مفہوم ہوگا ایسے نظام یا معاشرہ کا قیام جس میں قوانین خداوندی کا اتباع کیا جائے۔ یہ اس اصطلاح کا وسیع اور جامع مفہوم ہے۔ نماز کے اجتماعات میں، قوانین خداوندی کے اتباع کا تصور محسوس اور سنی ہوئی شکل میں سامنے آجاتا ہے، اس لئے قرآن کریم نے اس اصطلاح کو ان اجتماعات کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ قرآنی آیات پر تھوڑا سا تدبر کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ کس مقام پر اقامتِ صلوٰۃ سے مراد اجتماعاتِ نماز ہیں اور کس مقام پر قرآنی نظام یا معاشرہ کا قیام۔ مفہوم القرآن میں یہ معانی، اپنے اپنے مقام پر واضح کر دیئے گئے ہیں۔

زکوٰۃ اسی طرح، مثلاً زکوٰۃ کی اصطلاح ہے۔ اس لفظ کا مادہ (ز۔ ک۔ و) ہے۔ جس کے بنیادی معنی، بڑھنا۔ پھولنا۔ پھلنا۔ نشوونما پانا ہیں۔ قرآن کریم نے اسلامی نظام یا مملکت کا فریضہ ایتائے زکوٰۃ بتایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ نظام قائم اس لئے کیا جاتا ہے کہ نوعِ انسان کو سامانِ نشوونما فراہم کیا جائے۔ زکوٰۃ کا مروجہ مفہوم یہ ہے کہ اپنی دولت میں سے ایک خاص شرح کے مطابق روپیہ نکال کر خیرات کے کاموں میں صرف کیا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس میں بھی زکوٰۃ کے قرآنی مفہوم کی ایک جھلک پائی جاتی ہے۔ لیکن قرآن کریم نے اسے ان خاص معانی میں استعمال نہیں کیا۔ اس لئے اس اصطلاح کو انہی معانی کے لئے مخصوص کر دینا قرآنی مفہوم کی وسعت اور ہمہ گیری کو مقید کر دینا ہوگا۔

دیگر اصطلاحات یہی صورت قرآن کریم کی دیگر اصطلاحات کی ہے ——— مثلاً کتاب۔ حکمت ملائکہ۔ جن۔ دنیا۔ آخرت۔ قیامت۔ ساعت۔ جنت۔ جہنم۔ ایمان۔ کفر نفاق۔ فسق۔ اثم۔ عدوان۔ تقویٰ۔ عبادت۔ وغیرہ۔ مروجہ تراجم میں ان اصطلاحات کے صرف وہی معنی دیئے گئے ہیں جو ہمارے ہاں متداول ہیں۔ لیکن مفہوم القرآن میں ان کے وہ وسیع اور ہمہ گیر معانی دیئے گئے ہیں جو مذکورہ بالا طریق سے متعین کئے گئے ہیں۔ ان مقامات پر غور کرنے سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ ان اصطلاحات کے مروجہ مقید مفہوم سے قرآنی تعلیم کس طرح

سمٹ جاتی ہے' اور ان کے قرآنی مفہوم سے اس کی وسعتیں کس طرح حدود فراموش ہو جاتی ہیں۔ ایک ایسی کتاب کو' جو زمان و مکان کے حدود سے ماوراء' اور تمام نوع انسان کے لئے' ہمیشہ کے لئے' ضابطہ ہدایت ہو' ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے۔

مروجہ مفہوم سے اختلاف؟

اس نکتہ کی وضاحت کی ضرورت اس لئے بھی پیش آئی ہے کہ (میرا تجربہ بتاتا ہے کہ) یہی وہ مقامات ہیں جہاں اعتراض کیا جاتا ہے کہ میں نے قرآن کریم کو بالکل نئے معنی پہنا دیئے ہیں۔ بعض حضرات تو جوش مخالفت میں یہاں تک آگے بڑھ جاتے ہیں کہ اسے "دین میں تحریف" قرار دیدیتے ہیں اور اس کے لئے دلیل یہ دیتے ہیں کہ میں نے ان مقامات میں مروجہ مفہوم سے اختلاف کیا ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے' یہ مروجہ مفہوم سے اختلاف نہیں' بلکہ مروجہ مفہوم کی محدودیت کو قرآن کی وسعت سے ہمکنار کر دینا ہے۔ ان مقامات میں دیکھنا یہ چاہیئے کہ جو مفہوم میں نے پیش کیا ہے' وہ ان الفاظ کے بنیادی معانی اور قرآن کریم کی کلی تعلیم کے خلاف تو نہیں۔ اس کے لئے لغات القرآن کے متعلقہ مقامات کا مطالعہ ضروری ہوگا' جہاں سے آپ کو میرے پیش کردہ مفہوم کی تشریح' دلیل اور سند مل سکے گی (مروجہ تراجم سے اختلاف کا ذکر ذرا آگے چل کر کیا جائیگا)۔

مذہب اور دین

(۱۰) قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے "مذہب" اور "دین" کے بنیادی فرق کا سامنے رکھنا بھی نہایت ضروری ہے۔ اسلام' دین ہے۔ مذہب نہیں۔ "مذہب" سے مفہوم یہ ہے کہ انسان' خدا کے ساتھ اپنا پرائیویٹ رشتہ جوڑے۔ اپنی نجات کی فکر کرے۔ اس کے لئے خدا کی "پرستش" کرتا رہے۔ باقی رہے دنیاوی امور اور اجتماعی مسائل حیات' سو انہیں اپنی صوابدید کے مطابق خود حل کرے۔ مذہب کا ان سے کچھ واسطہ نہیں۔ اس کے برعکس' دین سے مقصود یہ ہے کہ

(۱) خارجی کائنات اور انسانی زندگی کے لئے اللہ تعالیٰ نے اٹل قوانین مقرر کئے ہیں۔ ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے سے کاروان انسانیت اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔

(۲) خارجی کائنات کے قوانین' علوم سائنس کی رُو سے معلوم کئے جا سکتے ہیں' لیکن انسانی دنیا سے متعلق قوانین' وحی کی رُو سے عطا ہوئے ہیں جو اب اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔

(۳) ان قوانین کا پورا پورا اتباع' انفرادی طور پر نہیں بلکہ اجتماعی طور پر' ایک نظام اور معاشرہ کے اندر ہو سکتا ہے۔ اسی کا نام' نظام خداوندی یا قرآنی معاشرہ (مملکت) ہے۔ جو معاشرہ اپنا تمام کاروبار قرآن کریم کے غیر متبدل اصول و احکام کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے سرانجام دے گا' وہ قرآنی معاشرہ کہلائے گا۔ اس معاشرہ کا قیام اور استحکام' جماعت مومنین کا فریضہ ہے۔

(۴) اس نظام کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ

(ا) افراد کی ذات کی نشوونما ہوگی جس سے وہ' اس زندگی کے بعد حیات اُخروی میں' زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

(ب) اس قوم کو اس دنیا میں سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب اور ایسی بین الاقوامی پوزیشن حاصل ہوگی جس سے وہ اقوام عالم میں عدل و مساوات کا آئین قائم کرنے کے قابل ہو جائے گی۔ اور

(ج) دنیا میں عدل و احسان اور امن و سلامتی کا دور دورہ ہو چلے گا۔

مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اس معاشرہ میں انسان کو دنیا اور آخرت دونوں میں جنت کی زندگی نصیب ہوگی۔

دین کے اس تصور کو سامنے رکھنے سے قرآنی تعلیم بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔

۱۱۔ اسی سلسلہ میں ایک اور اہم نکتہ کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ قرآن کریم میں جو کچھ خارجی کائنات یا انسانی دنیا (انفس و آفاق) کے متعلق کہا گیا ہے یا جن امور کو تشبیہات اور تمثیلات کے انداز میں بیان کیا گیا ہے ان کا مفہوم انسانی علم کی وسعت کے ساتھ زیادہ نکھر کر سامنے آتا جائے گا۔ ان مقامات کو ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق سمجھ سکتے ہیں۔ لہٰذا ان مقامات میں قرآنی فہم ہر دور میں بدلتا (اور انسانی علم کی بلندی کے ساتھ بلند ہوتا) جائے گا۔ جو شخص ان مقامات کو آج سمجھنا چاہتا ہے اس کے سامنے انسانی علم کی موجودہ سطح کا ہونا ضروری ہے۔ پھر بھی اسے یہ کہنے کا حق نہیں پہنچتا کہ جو کچھ اس نے سمجھا ہے وہ اس باب میں حرف آخر ہے۔ حرف آخر کا حق تو آخری انسان کے لئے ہی چھوڑنا ہوگا اور وہ بھی ان میں سے بعض امور کی کنہ و حقیقت کے متعلق اتنا ہی سمجھ سکے گا جتنا شعور کی موجودہ سطح پر انسان کے لئے سمجھنا ممکن ہے۔ اس کی تفصیل لغات القرآن میں ملے گی۔

متشابہات

علاوہ ازیں جوں جوں انسان کی تمدنی اور عمرانی زندگی پھیلے گی زندگی کے نئے نئے مسائل اور انسانیت کے نئے نئے تقاضے سامنے آئیں گے۔ قرآن کریم کے بیان کردہ اصولوں میں اتنی جامعیت ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ان تقاضوں کا آخری حل اپنے اندر رکھتے ہیں۔ لیکن یہ حل معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک طرف انسان کے سامنے قرآن کریم کے جامع عالمگیر اور غیر متبدل اصول ہوں اور دوسری طرف زندگی کے نئے نئے تقاضے بھی اس کے پیش نظر ہوں۔

انسانیت کے نئے مسائل

اپنے دور سے الگ ہٹ کر نہ قرآنی تعلیم کو کماحقہٗ سمجھا جا سکتا ہے نہ اس سے مطلوبہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

۱۲۔ یہ بھی واضح رہے کہ قرآن کریم نے جو کچھ اقوام سابقہ یا خود زمانۂ نزول قرآن کے مخاطبین کے متعلق کہا ہے اس سے ان کی تاریخ پیش کرنا مقصود نہیں۔ ان سے یہ بتانا مطلوب ہے کہ جب انسان قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس کا نتیجہ کس قدر تباہ کن اور ہلاکت انگیز ہوتا ہے اور جب وہ اپنے معاشرہ کو ان قوانین کے مطابق متشکل کرتا ہے تو اس سے اس قوم کو کس قدر شادابیاں اور سرفرازیاں نصیب ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو اقوام گذشتہ کی داستانیں قوانین خداوندی کے اٹل نتائج کی زندہ شہادتیں بن کر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ لہٰذا ان واقعات کا تعلق ماضی سے نہیں بلکہ خود ہمارے حال سے ہے۔ قرآن فہمی کے سلسلہ میں اس حقیقت کا سامنے رکھنا بھی ضروری ہے۔

اقوام سابقہ

۱۳- ہمارے مروجہ عقائد اور مسلک میں بہت کچھ ایسا بھی ہے جو قرآن کریم کے خلاف یا اس سے خارج ہے۔ چونکہ مفہوم القرآن سے مقصد 'قرآن کریم کا مفہوم بیان کرنا ہے' اس لئے اس میں خارج از قرآن کسی بات کو نہیں آنے دیا گیا۔ یہ بھی یاد رہے کہ میرے نزدیک یہ شرک ہے کہ انسان اپنے ذہن میں پہلے سے کوئی خیال لے کر قرآن کریم کی طرف آئے' اور پھر قرآن سے اسکی تائید تلاش کرنا شروع کر دے۔ قرآن سے صحیح راہ نمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان خالی الذہن ہو کر اس کی طرف آئے' اور اس کے ہاں سے جو کچھ ملے' اسے من وعن قبول کرے' خواہ یہ اس کے ذاتی خیالات' رجحانات' معتقدات اور معمولات کے کتنا ہی خلاف کیوں نہ ہو۔ ہمارا مقصد ہے اپنے ایمان وعمل کو قرآن کے مطابق بنانا۔ نہ کہ (معاذ اللہ) قرآن کو اپنے ایمان وعمل کے قالب میں ڈھالنا۔ میں نے قرآن کریم سے' اسی انداز سے راہ نمائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس سلسلہ میں میرے فہم نے کہیں غلطی کی ہو۔ لیکن میں نے قرآنی تعلیم کو اپنے کسی خیال یا رجحان کے تابع رکھنے کی جسارت کبھی نہیں کی۔ اللہ اس سے محفوظ رکھے۔

مروجہ مسالک

۱۴- میں جانتا ہوں کہ تبویب القرآن' معارف القرآن (قرآنی انسائیکلوپیڈیا) لغات القرآن اور مفہوم القرآن جیسے کام تنہا افراد کے کرنے کے نہیں ہوتے۔ یہ کام جماعتوں کے کرنے کے ہوتے ہیں ـــــ لیکن میرا شروع ہی سے انداز یہ رہا ہے کہ اگر کسی ایسے کام کے لئے' جس کا کرنا ضروری ہو' کوئی جماعت میسر نہ آئے' تو انسان کو یہ کہہ کر خاموش نہیں بیٹھ جانا چاہیئے کہ میں تنہا کیا کر سکتا ہوں۔ اسے چاہیئے کہ وہ جو کچھ کر سکتا ہے' ضرور کرے۔ اگر اس کام میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے تو وہ زندہ رہے گا۔ اس کے بعد جب دیگر افراد یا جماعتیں' اس کی طرف توجہ دیں گی تو اس کی یہ محنت "بنیادی ذرہ" (FIRST CRYSTAL) کا کام دے گی۔ میں نے ہمیشہ اسی اصول کے مطابق کام کیا ہے جس کا نتیجہ ـــــ سلسلۂ معارف القرآن ـــــ من ویزداں' ابلیس وآدم' جوئے نور' برق طور' شعلۂ مستور' معراج انسانیت (یعنی صاحب قرآن علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت طیبہ خود قرآن کی روشنی میں)' اسباب زوال امت' اسلامی معاشرت' نظام ربوبیت' فردوس گمگشتہ' سلیم کے نام خطوط' طاہرہ کے نام خطوط' انسان نے کیا سوچا' لغات القرآن اور مفہوم القرآن کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ "تبویب القرآن" کا مبسوط سلسلہ (جو ابھی شائع نہیں ہوا) اس سے الگ ہے۔ اس میں قرآن کریم کی آیات کو' سینکڑوں عنوانات کے تابع تقسیم کیا گیا ہے تاکہ جس عنوان کے متعلق آپ چاہیں' تمام آیات بیک وقت آپ کے سامنے آجائیں ماہنامہ طلوع اسلام کے ہزارہا صفحات پر پھیلے ہوئے میرے مضامین اس پر مستزاد ہیں۔

فرد واحد کی کوشش

۱۵- مفہوم القرآن کی اشاعت سے پہلے سورۂ بقرہ کی چند ابتدائی آیات کا مفہوم' بطور نمونہ شائع کیا گیا تھا' اور احباب سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اپنی آراء اور مشوروں سے مجھے سرفراز فرمائیں۔ للہ الحمد کہ ان کی طرف سے مجھ تک یہ آواز متفقہ طور پر پہنچی ہے کہ یہ کوشش' مقصد پیش نظر کے لئے کامیاب ہے

اور اس سے قرآن کریم کا مفہوم، بغیر کسی دقت اور کاوش کے، آسانی سمجھ میں آجاتا ہے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔ لیکن بہرحال یہ خشت اوّل ہے۔ بعد میں آنے والے اس بنیاد پر اس سے کہیں بہتر عمارت استوار کر سکیں گے۔

۱۵۔ مفہوم القرآن کے متعلق یہ بھی کہا جائے گا کہ یہ اکثر مقامات پر مروجہ تراجم سے مختلف ہے۔

مُروّجہ تراجم اور مفہوم القرآن اس ضمن میں سب سے پہلے اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ یہ قرآن کریم کی آیات کا مفہوم ہے، ان کا ترجمہ نہیں۔ اور ترجمہ اور مفہوم میں جو فرق ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ جو مفہوم دیا گیا ہے وہ عربی لغت اور قرآن کریم کے مطابق ہے یا نہیں۔

تراجم میں اختلاف دوسرے یہ کہ مروجہ تراجم بھی سب کے سب ایک دوسرے کے مطابق نہیں۔ ان میں بھی باہمی اختلاف ہے۔ مثال کے طور پر دو (مستند) تراجم کو لیجئے۔ شاہ عبدالقادرؒ کے مشہور ترجمہ قرآن کریم میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم نے ترمیم کی اور مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم نے اس پر حواشی لکھے۔ گویا یہ ترجمہ اتنے بڑے پایہ کے تین علماء کرام کے نزدیک صحیح اور قابلِ اعتماد ہے۔ اس میں سورۂ بقرہ کی آیت

وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ (۲:۱۰۲)

کا ترجمہ یہ لکھا ہے۔

(اور اس علم کے پیچھے ہو لئے) جو اترا دو فرشتوں پر شہر بابل میں۔

اس ترجمہ کی رو سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کہا یہ ہے کہ بابل میں دو فرشتوں پر کچھ نازل ہوا تھا۔

دوسرا ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا لیجئے۔ اس میں اس آیت کا ترجمہ یہ دیا ہے۔

یہ بھی صحیح نہیں کہ بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر اس طرح کی کوئی بات نازل ہوئی تھی۔

اس ترجمہ سے ظاہر ہوا کہ بابل میں ہاروت و ماروت فرشتوں پر کچھ نازل نہیں ہوا تھا۔ یہ دونوں ترجمے ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں، بلکہ ان میں باہمی تضاد ہے۔ اگر اس تضاد کے باوجود، ان پر اعتراض نہیں ہو سکتا تو، مفہوم القرآن کے بعض مقامات کا موجودہ تراجم سے اختلاف، موجبِ اعتراض کیوں سمجھا جائے؟ متقدمین اور متاخرین نے جو کچھ قرآن کریم کے متعلق لکھا ہے، میں نے، بقدرِ استطاعت اس سے استفادہ کیا ہے۔ وہ ہمارے بزرگوں کا علمی سرمایہ ہے جس کے ہم وارث ہیں۔ اس لئے اس سے کیوں نہ استفادہ کیا جائے؟ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان سے کسی بات میں اختلاف کرنا جرم یا گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں غور و تدبر کا حکم ہر دور کے انسانوں کو دیا ہے۔ اگر آج کسی کے غور و تدبر کا نتیجہ کسی سابقہ دور کے حضرات (یا موجودہ دور کے دیگر حضرات) کے غور و تدبر سے مختلف ہو، تو محض یہ اختلاف باعثِ اعتراض کیوں سمجھا جائے؟ اختلاف کا حق

اختلاف مبنی بر تدبر فی القرآن

کسی سے نہیں چھینا جا سکتا۔ (جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے) دیکھنا یہ چاہیئے کہ جو کچھ کہا گیا ہے' وہ عربی زبان اور قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف تو نہیں۔ میں ارباب بصیرت سے درخواست کروں گا کہ وہ مفہوم القرآن کا غائر نگاہ سے مطالعہ کریں' اور اگر ان کی دانست میں کوئی مقام ایسا ہو جو عربی لغت یا قرآنی تعلیم کے خلاف جاتا ہے' تو مجھے مطلع فرمائیں۔ میں ان کا شکر گذار ہوں گا اور ان کے اعتراض پر پوری توجہ دوں گا۔ لیکن جو حضرات یہ کہیں کہ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِیْنَ (۲۳/۲۴)۔ تو وہ مجھے معذور سمجھیں۔

حروف مقطعات

۱۶۔ چند الفاظ حروف مقطعات (الٓمّٓ وغیرہ) کے سلسلہ میں ضروری ہیں۔ میں نے لغات القرآن میں ان کے معانی بیان نہیں کئے۔ اس لئے کہ اس میں' قرآنی مفردات کے معانی ان کے مادوں کی روشنی میں متعین کئے گئے ہیں' اور مقطعات درحقیقت مفردات ہیں ہی نہیں۔ مقطعات کے متعلق' متقدمین سے لے کر متاخرین تک نے بہت کچھ لکھا ہے اور اس باب میں مختلف ارباب تحقیق کی آراء مختلف ہیں۔ اس حد تک قریب قریب سب کا اتفاق ہے کہ عربوں میں الفاظ کو مخفف کر کے بولنے کا رواج تھا۔ مخفف کرنے کا ایک طریق یہ بھی ہے کہ اہم الفاظ کا ایک ایک حرف لے لیا جائے اور ان حروف کے مجموعہ کو' ان الفاظ کا مجموعہ تصور کر لیا جائے۔ قرآن کریم کے مقطعات کے متعلق میرا بھی یہی خیال ہے۔ یہ بالعموم اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنیٰ کے مخففات ہیں۔ مثلاً الٓمّٓ "اللہ۔ علیم و حکیم" کا مخفف ہے۔ وقس علیٰ ذالک۔ میں نے ان کے مفہوم کے متعلق یہی انداز اختیار کیا ہے۔

تصریف آیات

۱۷۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے' قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک مضمون کو مختلف مقامات پر بیان کرتا ہے اور اس طرح تصریف آیات (یعنی آیات کو پھیر پھیر کر لانے) سے اپنے مفہوم کی وضاحت کر دیتا ہے۔ مفہوم القرآن میں قرآن کریم کے اس انداز کو التزاماً سامنے رکھا گیا ہے اور ہر متعلقہ مقام پر اس آیت کا حوالہ دیا گیا ہے جس سے وہ مفہوم لیا گیا ہے۔ مثلاً آپ کو' سورۂ بقرہ کی آیت ۲/۲ (ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ) کا مفہوم یوں ملے گا:-

> تم جس ہدایت کی آرزو رکھتے ہو (۱/۵) وہ ہمارے اس ضابطۂ قوانین کے اندر محفوظ ہے (۱۵/۹) جس میں نہ بے یقینی اور تذبذب ہے' نہ کوئی نفسیاتی الجھن۔

(۱/۵) کا مطلب یہ ہے کہ یہ مضمون آپ کو پہلی سورہ (الفاتحہ) کی پانچویں آیت میں ملے گا۔ وہاں دیکھئے۔ اسی طرح (۱۵/۹) سے مراد یہ ہے کہ یہ مضمون پندرھویں سورہ (الحجر) کی نویں آیت میں ملے گا۔ یہ ضروری ہے کہ آپ ان آیات کو جن کا اس طرح حوالہ دیا گیا ہے' ساتھ کے ساتھ دیکھتے جائیں۔ چونکہ قرآن کریم کے تمام نسخوں میں آیات کے نمبر یکساں نہیں' اس لئے اگر کسی وقت متعلقہ آیت نمبر کے مطابق نہ ملے' تو ایک دو آیات آگے پیچھے دیکھ لی جائیں۔

باقی رہا یہ کہ مندرجہ بالا آیت (۲/۲) میں' لفظ رَیْب کا مفہوم' بے یقینی' تذبذب' اور نفسیاتی الجھن

کس طرح ہے' تو اس کے لئے لغات القرآن دیکھئے۔ اگر آپ نے مفہوم القرآن کو اس طریق سے سمجھنا شروع کیا تو آپ دیکھیں گے کہ قرآن کریم کس طرح آپ سے خود باتیں کرنے لگتا ہے۔

انسانی کوشش

۱۸۔ آخر میں' پھر اس حقیقت کو دُہرا دینا چاہتا ہوں کہ جو کچھ مفہوم القرآن میں پیش کیا گیا ہے' وہ فہم قرآن کی انسانی کوشش ہے' اور انسانی کوشش کبھی سہو و خطا سے منزّہ نہیں ہو سکتی' نہ ہی اسے کبھی حرفِ آخر کہا جا سکتا ہے۔ میں نے قرآن فہمی کے سلسلہ میں' اپنی بصیرت کے مطابق' ایک نئی طرح ڈالی ہے۔ اگر میری یہ کوشش نتیجہ خیز ہوئی' تو مجھ سے بہتر صلاحیتیں رکھنے والے' اسے واضح سے واضح تر کرتے جائیں گے' اور یوں یہ سلسلہ' قانونِ کائنات کے مطابق' اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ قرآن فہمی کا سلسلہ نہ کسی دور میں ختم ہو سکتا ہے' نہ کسی انسان تک پہنچ کر رک سکتا ہے۔ یہ ایک جوئے رواں ہے جو لامتناہی وسعتوں کا امکان رکھتی ہے۔ جوں جوں انسانی علم وسیع ہوگا' قرآنی حقائق' بیش از بیش بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہے گا' حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ۔

۱۹۔ مفہوم القرآن کا اوّلین مخاطب قوم کا تعلیم یافتہ طبقہ ہے۔ یہ بنیادی طور پر انہی کے لئے مرتب کیا گیا ہے۔ اگر میری اس کوشش سے ایک سوچنے والا ذہن بھی قرآن کریم کے قریب آ گیا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ثمربار ہو گئی' اور مجھے میری دیدہ ریزیوں اور جگر کاویوں کا صلہ مل گیا —— اور سب سے بڑا صلہ تو اس بارگاہ صمدیت سے مل سکتا ہے' جس کے قانونِ حیات کے مطابق چلنے سے' انسانی کوششیں صحیح نتائج مرتب کرتی ہیں۔ اس لئے جب میں اپنی محنت کا یہ ماحصل' اپنی کوتاہ ذہنی کے اعتراف کے ساتھ' اربابِ فکر و نظر کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں' اس کے ساتھ ہی میرے دل کی گہرائیوں سے اُبھرنے والی آرزوئیں یہ دعا بن کر میرے لب تک آ جاتی ہیں کہ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۗ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۲۸۶/۲)

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۗ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ (۱۲۷/۲)

۲۵۔ بی گلبرگ
لاہور

پرویز
جولائی ۱۹۶۱ء

رابطہ باہمی

جامع رپورٹ بزمہائے طلوع اسلام - بابت ماہ جون ۱۹۶۱ء

لاہور

(ا) بزم کے ماہانہ اجلاس باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔
(ب) لغات القرآن کے درس کا سلسلہ ماہ جولائی سے شروع کیا جا رہا ہے۔
(ج) مفہوم القرآن کے چار خریدار بنائے گئے۔

شادرہ

بزم باقاعدگی سے اپنے اجلاس کر رہی ہے۔ (ا) مجلس عاملہ سے موصول شدہ پمفلٹس علم دوست حضرات میں تقسیم کئے گئے۔ (ب) بزم نے کئی ماہ کا عطیہ مجلس عاملہ کو پیشگی ادا کر دیا ہے۔ (ج) ٹیپ ریکارڈ پر درس کا سلسلہ جاری ہے اور بہت مقبول ہو رہا ہے۔

رے والا

بزم کے ہفتہ وار اجتماعات بڑی باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ (ا) لوگوں کو تحریک طلوع اسلام سے متعارف کرانے کے لئے پمفلٹوں کی تقسیم کے علاوہ گذشتہ ماہ ایک کھلا اجلاس بلایا گیا جس میں مقامی علم دوست حضرات کو مدعو کیا گیا۔ "خدا اور انسان کا باہمی تعلق" کے موضوع پر اظہار خیال کیا گیا۔ ایسے کھلے اجلاس ماہ بلانے کا پروگرام ہے۔ (ب) لغات القرآن کے درس کا سلسلہ جاری ہے۔ (ج) رسالہ طلوع اسلام کے آٹھ نئے خریدار بنائے گئے۔

بزم کے پیش نظر ہر ماہ کھلے اجلاس بلانے کا پروگرام ہے۔ اس لئے وہ طلوع اسلام کے ذریعے تمام احباب سے اپیل کرتی ہے کہ قرآنی فکر کے عام کرنے کے لئے بزم سے رابطہ قائم کریں اور ان اہم اجتماعات کو کامیاب بنائیں۔

ل پور

(ا) بزم کا اجلاس مورخہ ۴ جون کو ہوا جس میں طے پایا کہ مجلس عاملہ سے پمفلٹس منگوا کر عام تقسیم کئے جائیں۔ (ب) بزم کے نمائندہ افتخار عالم صاحب منتخب ہوئے ہیں۔

پتہ بزم:۔ افتخار عالم صاحب۔ نمائندہ بزم طلوع اسلام۔ تھری سٹار ہوزری۔ سی۔ ماڈل ٹاؤن۔ لائل پور۔

مری

مری کی گل پوش وادیوں میں فکرِ قرآن کا ورود بڑا مبارک ثابت ہوا۔ ۶ر جولائی کو ہم میں کیریکٹر کیونکر بنے کے عنوان سے ایمبیسڈر ہال میں ان کا علم افروز خطاب سینکڑوں اصحاب کے لئے شادابیٔ قلب ونظر کا سامان تھا۔ یہاں کی علمی مجالس میں کئی دن تک اس کے چرچے رہے اور اسے جگہ جگہ خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ پرویز صاحب کے مختصر سے قیام کے باعث مری کی شاداب فضا قرآنی فکر کی سرمستیوں میں جھومتی رہی۔

سرگودھا

(ا) بزم کا اجلاس ۲ر جون کو منعقد ہوا۔ جس میں بزم چک ۱۵ شمالی کے نمائندہ محترم نصر اللہ خاں صاحب اور بزم پنڈدادن خاں کے دو احباب نے شرکت فرمائی۔ (ب) بزم کی ازسرنو تشکیل کی گئی۔

بزم کے ہفتہ وار اجتماعات باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔

چک جھمرہ

(ا) مجلس عاملہ سے موصول شدہ پمفلٹس تقسیم کئے جا رہے ہیں جس سے کافی حوصلہ افزا نتائج مرتب ہو رہے ہیں۔ ہر ماہ بزم کی رکنیت میں ایک دو نئے ممبران کا اضافہ ہو رہا ہے۔ بزم کے احباب کی کوششوں سے قرآنی فکر سے متعلق لٹریچر، دیہات میں بھی پہنچایا جا رہا ہے۔

لندن

(ا) ماہانہ اجلاس مورخہ ۲۴ر جون ۱۹۶۱ء کو جناب گلزار احمد صاحب چغتائی کے دولتکدہ پر منعقد ہوا۔ جس میں اراکین بزم کے علاوہ چند نئے احباب نے شرکت کی جن میں زیادہ تعداد طلباء کی تھی۔ محترم پرویز صاحب کی تقاریر جو کہ امسالہ کنونشن میں کی گئی تھیں بذریعہ ٹیپ ریکارڈ سنائی گئیں۔ جس سے حاضرین کافی متاثر ہوئے۔

(ب) حاجی فقیر محمد خاں صاحب (مردان) کے سانحۂ انتقال پر اظہارِ تعزیت کیا گیا۔

(ج) عائلی قوانین کے آرڈی ننس کے نفاذ پر صدر مملکت پاکستان کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کیا گیا۔

سیالکوٹ

بزم کا اجلاس ۱۸ر جون کو منعقد ہوا۔ بزم کافی عرصہ سے بے عملی کا شکار ہو رہی تھی۔ اس اجلاس میں ممبران نے عہد کیا کہ آئندہ وہ تحریک سے لوگوں کو روشناس کرانے کے لئے سرگرمی سے کام کریں گے۔

مجلس عاملہ سے موصول شدہ سرکلرز کو زیرِ غور لایا گیا اور مفہوم القرآن کا ایک خریدار بنایا گیا۔

کوئٹہ

سالانہ کنونشن منعقدہ اپریل ۱۹۶۱ء کے بعد سے بزم کی سرگرمیاں زوروں پر ہیں۔ مجلس عاملہ سے موصول شدہ پمفلٹس بھاری تعداد میں مقامی حضرات میں تقسیم کئے گئے۔ رسالہ طلوعِ اسلام کے چند نئے خریدار بنائے گئے۔ بزم کی لائبریری کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ہفتہ وار اجتماعات میں لغات القرآن کا درس جاری ہے۔ جس کا انتہائی مسرت سے خیر مقدم کیا گیا ہے۔ محترم حسن عباس رضوی صاحب کی

کوششیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ موصوف لوگوں کو تحریک سے روشناس کرانے میں مستعدی سے سرگرم عمل ہیں۔

شکر گڑھ (ضلع سیالکوٹ) بزم کا اجلاس ۲۵ جون کو بزم کے نئے نمائندہ چوہدری فیروز الدین صاحب کے مکان میں ہوا۔

لغات القرآن کے درس کی ابتدا کی گئی ہے۔

پنج کسی (ضلع ملتان) اجلاس باقاعدگی سے ہو رہے ہیں اور درس لغات القرآن کا سلسلہ جاری ہے۔

جون کا نصف عطیہ مجلس کو ارسال کیا گیا۔

مفہوم کے چھ نئے پیشگی خریدار بنائے گئے۔

کراچی ٹیپ ریکارڈ پر ہفتہ وار درس کا سلسلہ جاری ہے۔ اجتماعات باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ درس لغات القرآن کا سلسلہ جاری ہے۔

راولپنڈی (ا) ماہانہ اجتماعات باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ (ب) ٹیپ ریکارڈ پر درس قرآن سنانے کا سلسلہ فی الحال ملتوی کر دیا گیا ہے۔ چونکہ موجودہ ٹیپ ریکارڈ کام نہیں دے رہا۔ اس لئے دوسرا ریکارڈ خریدنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں جناب شیخ محمد شفیع صاحب نمائندہ بزم طلوع اسلام کراچی نے مبلغ ۵۰۰/- روپے کی فراخدلانہ پیش کش کی ہے۔

(ج) مجلس عالمہ طلوع اسلام سے وصول شدہ پمفلٹس عوام میں باقاعدگی سے تقسیم کئے جا رہے ہیں۔

چارباغ (ضلع مردان) چارباغ ضلع مردان میں نئی بزم کا قیام عمل میں آیا ہے نمائندہ ڈاکٹر فضل خالق صاحب منتخب ہوئے ہیں۔ بزم گو نئی ہے مگر تحریک کو پھیلانے میں سرگرمی سے مصروف عمل ہے۔ گذشتہ ماہ رسالہ کے چار نئے خریدار بنائے گئے اور چار احباب نے رکنیت بزم قبول کی۔

محترم پرویز صاحب کی مطبوعات زیر مطالعہ ہیں۔

⁂

اعلان توثیق ادارہ طلوع اسلام بزم چارباغ کی منظوری کا اعلان کرتا ہے۔

خط و کتابت کرتے وقت

اپنا پتہ صاف اور خوشخط لکھئے اور خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔